راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی
مدیر: حسن عباسی

جولائی ۲۰۲۰ء

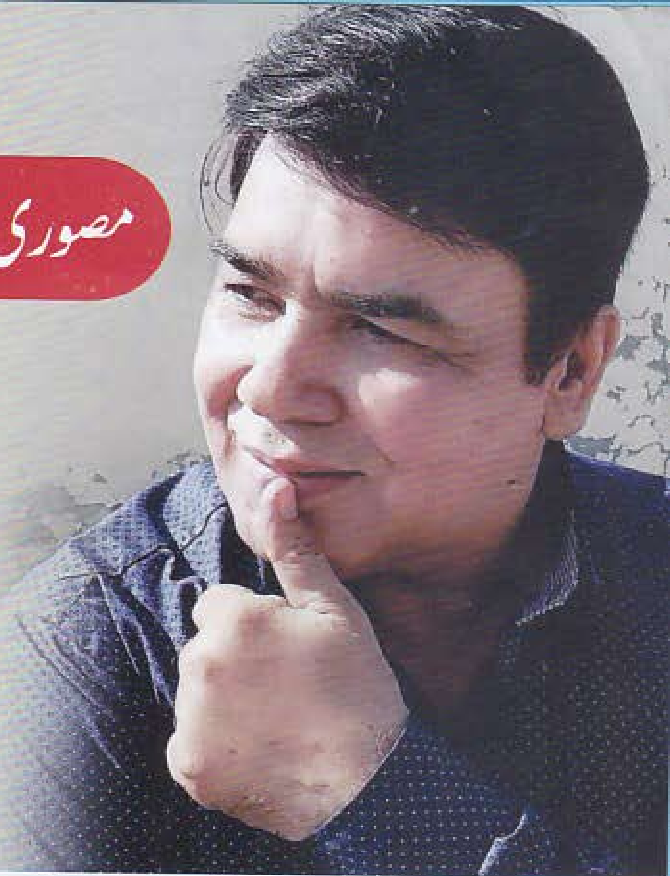

مصوری مجھے شاعری ہی کی ترجمان محسوس ہوتی ہے

نامور شاعر، مصور، کالم نگار اور براڈ کاسٹر

راجا نیّر سے

مدیرِ اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفر نامہ نگار

عامر بن علی کا مکالمہ

میں اوّل و آخر شاعر ہوں...... باقی فنون سے وابستگی شوقیہ ہے

س۔ سب سے پہلے اپنے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجیے؟

ج۔ عامر بھائی یہ میری خوش بختی ہے کہ میں ایک ترقی پسند، شاعر، دانشور، انسان دوست ہستی لطیف ادیب کے گھر پیدا ہوا۔ میرے دادا جان چراغ الدین محمد دائم (قانونگو، زمیندار) اردو، پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور مصوری و موسیقی سے بھی انھیں گہرا شغف تھا۔ افسوس کہ وہ 1935 کے قریب ٹی بی کے باعث انتقال کر گئے۔ والد گرامی جناب لطیف ادیب استاد شاعر مانے جاتے تھے۔ انہیں بھی مصوری و موسیقی سے لگاؤ تھا۔۔ چونکہ لکھنا پڑھنا میری سرشت میں شامل تھا، اور شائد اسی لیے فنون لطیفہ سے بھی میں فطری طور پر وابستہ ہوگیا۔ کچھ ہمارے شہر پاک پتن کی ادبی و روحانی فضا کے زیر اثر میں بھی کسی خاص لمحۂ عنایت و کرم میں فیض یاب ہوگیا ایسی ہی کسی ساعت میں والدین کی دعاؤں کے نتیجے میں مجھ پر خاص کرم ہوا اور مالک نے مجھے شعورِ شاعری بخش دیا۔

تب میں اپنے سینیئرز کے زیر سرپرستی اوائل عمری ہی سے ادبی خدمات انجام دینے لگا۔ 80ء کی دہائی میں اوکاڑہ، بورے والا اور ساہیوال کے ادبی حلقوں میں بھرپور شرکت کی۔ اس وقت کے متحرک دوستوں میں قمر رضا شہزاد، جمیل احمد عدیل، کاشف سجاد، مسعود اوکاڑوی، رشید تبسم، سرور جاوی، علی رضا میرے ذاتی دوست ہیں۔ ان سے اَن گنت خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ اُس وقت اپنے چند دوستوں کو دادا جان کے اشعار سُنایا کرتا تھا۔ ایک بار یہ شعر سُنایا تو چند ہی دنوں کے بعد خیال جوں کا توں سرقہ کر لیا گیا۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 21 جولائی 2020 شمارہ نمبر 7

/سرگودھا مدیرِ اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلسِ ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ لبنیٰ صفدر ◉ ابرار ندیم

{مجلسِ مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ • زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر • نعمان حسن :0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نارو کاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت / ، 2

مضامین:

○ ناصر کاظمی کی نے نوازی / پروفیسر فتح محمد ملک ، 3

○ نذیر قیصر کی شاعری / جمیل یوسف ، 10

○ تحقیق کے زاویے / ڈاکٹر مختار عزمی ، 13

○ عباس تابش کی شاعری میں تشبیہ و استعارہ کی خوبصورتی / ثاقب تبسم ثاقب ، 18

○ لفظوں کی مہک / سمیرا قیوم ، 21

○ تیری ممتا ہے آسرا میرا / نازبٹ ، 18

○ ڈاکٹر جعفر حسن اور اُن کا سفرنامہ "اے ارضِ لبنان" / ڈاکٹر اختر شمار، ڈاکٹر طاہر شہیر ، 25

افسانے

○ امی / عمار مسعود ، 27

○ اسپشلسٹ / روبنسن گل ، 29

○ ایسٹی لاڈر / شائستہ مفتی ، 34

○ سرد خانہ / شاہد سلیم شاہد ، 36

○ مگرمچھ / نوین روما ، 38

شعری گوشے:

○ امجد اسلام امجد، غزالی، آصف انصاری، شازیہ رباب 41 تا 44

سفرنامہ ○ ہاچیکو۔ وفا کی علامت / عامر بن علی ، 45

کالم ○ دیکھتی آنکھیں سنتے کانوں / لبنیٰ صفدر ، 46

شاعری 47 تا 50

○ انٹرویو: راجا نیئر ، 51

○ انٹرویو: ممتاز راشد لاہوری ، 53

خطوط ، 56

+++++

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

گود جب سے بھری ہے صاحب جی
کھوٹی قسمت کھری ہے صاحب جی
جانے کس نے سکھائی ہے ہم کو
ہر طرف بت گری ہے صاحب جی
میں ترو تازہ کیوں نہیں ہوتا
جب محبت ہری ہے صاحب جی
اُس کہانی کا کیا کیا جائے
وہ جو مجھ میں مری ہے صاحب جی
آسماں سر پہ ہم اُٹھائیں گے
اپنی تو نوکری ہے صاحب جی
آ گئی ہے کنارے سے باہر
لہر کتنی ہری ہے صاحب جی
میرے اندر ہیں کوہ قاف کے جن
میرے اندر پری ہے صاحب جی

حسن عباسی/لاہور

کاش مل جائیں وہ بال و پر مجھے
جو دکھا لائیں نبیؐ کا در مجھے
جس طرف دیکھوں ہے عکسِ مصطفیٰؐ
دِکھتا ہے بس ایک ہی منظر مجھے
کب مدینے سے بلاوا آئے گا
پوچھتی ہے روز چشمِ تر مجھے
ہے درودِ پاک ہی وردِ زباں
بس وظیفہ ہے یہی ازبر مجھے
جنسِ عصیاں کام آئی ہے بہت
ڈھونڈتے ہیں شافعِ محشر مجھے
ڈھونڈتی پھرتی ہیں مجھ کو منزلیں
مل گیا ہے جب سے وہ رہبر مجھے
تشنگی ہوگی وہ کتنی معتبر
گر پلائیں ساقیِ کوثر مجھے
کالی کملی اوڑھنے والے جلیلؔ
لگتے وہ نور کا پیکر مجھے

احمد جلیل/اوکاڑہ

ہم ہیں حضوؐر پاک کی اُلفت کے سائے میں
اک پیکرِ جمال کی رحمت کے سائے میں
آنے سے پہلے آپؐ کے تاریک تھا جہاں
اب زندگی ہے آپؐ کی چاہت کے سائے میں
لعل و گہر تو مانگنے کی جستجو نہیں
خواہش ہے بیٹھیں آپؐ کی شفقت کے سائے میں
لطف و کرم کے پھول بھی سارے سمیٹ کر
دامن سجائے بیٹھے ہیں قسمت کے سائے میں
ہے آمنہؓ کے لالؐ کی نظرِ کرم مجید
رہتے ہیں سب ہی آپؐ کی مدحت کے سائے میں

عبدالمجید چٹھہ/لاہور

جاں رہینِ مصطفیٰؐ ہے، دل شکارِ مصطفیٰؐ
میری نس نس میں بسا ہے انتظارِ مصطفیٰؐ
اپنے دل میں سوچتی تو ہوگی فردوسِ بریں
کاش میں ہوتی زمانے میں دیارِ مصطفیٰؐ
روزۂ اطہر ہے جس پر، وہ زمیں ہے آسمان
غازۂ خورشید ہے، گردِ مزارِ مصطفیٰؐ
ہم تو اُس انسان کو کر لیتے ہیں سر پر سوار
جس میں آتا ہے نظر ہم کو شعارِ مصطفیٰؐ
رحم، شفقت، دردمندی، رہنمائی اور دعا
تھا یہی بزمِ جہاں میں کاروبارِ مصطفیٰؐ
کس قدر اس پہ کرم تو نے کیا نعتِ رسول
قلبِ شیوہ ہو گیا ہے ہم کنارِ مصطفیٰؐ

شریف شیوہ/لاہور

آپ بولیں تو بہاروں پہ بہار آتی ہے
مسکرائیں تو نظاروں پہ بہار آتی ہے
آپ ہیں بحرِ کرم آپ کے کیا کہنے ہیں
موج میں ہوں تو کناروں پہ بہار آتی ہے
چاند کے ٹکڑے کبھی شمس بھی مڑ کر بولے
سرورِ دین کے اشاروں پہ بہار آتی ہے
جوش میں موسمِ رحمت کا سماں آئے جب
تب خزاؤں کے بھی ماروں پہ بہار آتی ہے
جب درِ قدس پہ چپ چاپ کھڑا ہوتا ہوں
میرے اشکوں کی قطاروں پہ بہار آتی ہے
کملی والے کے سخن اور تبسم کی قسم
گلعزاروں کے قراروں پہ بہار آتی ہے
ہر گھڑی نعت پیمبر کے بیاں سے ہر سو
اہلِ ایماں کے سپاروں پہ بہار آتی ہے
آپ کو جب بھی خزاں دیدہ پکاریں آقاؐ
اک نہیں پھر تو ہزاروں پہ بہار آتی ہے
شجرِ مرسل میں خزاؤں کا کوئی نام نہیں
پھول تو پھول ہیں خاروں پہ بہار آتی ہے
آپ کی چشمِ کرم لطفِ عطا کے صدقے
بے سہاروں کے سہاروں پہ بہار آتی ہے
تذکرہ جب بھی کیا جاتا ہے یوں حسنِ ازل کا
چاند تو چاند ستاروں پہ بہار آتی ہے
پھول مدحت کے وہ جس وقت اُگائیں ساجد
اس گھڑی نعت نگاروں پہ بہار آتی ہے

امین ساجد/حاصل پور

ناصر کاظمی کی نَے نوازی

پروفیسر فتح محمد ملک/ اسلام آباد

اس سے ستر برس پیشتر ہمارے ادبی آفاق پر ناصر کاظمی کا طلوع ایک نئے طرزِ فکر و احساس کی بشارت ثابت ہوا تھا۔ یہ ناصر کی تخلیقی شخصیت کا فیضان ہے کہ جدید ادب میں روایت کے خلاف بغاوت کا چلن تمام ہوا اور روایت کی بازیافت کے عمل کا آغاز ہوا۔ اقبال کے خلاف ردِّعمل کا نقشہ پیش کرنے والی ترقی پسند اور جدید ادب کی تحریکوں سے وابستہ ادیب اور شاعر ہماری ادبی روایت کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ ایسے میں جب ناصر کاظمی نے ہماری اپنی ادبی اور تہذیبی روایت کے احیاء کی مہم شروع کی تو اُن کے اردگرد نئی پود کے تخلیق لکھنے والوں کا ایک حلقہ قائم ہو گیا۔ روایت کے باغی ادیبوں اور شاعروں نے صنفِ غزل کو بڑی حد تک ایک متروک صنفِ سخن بنادیا تھا۔ مغرب زدہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ اگر غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن گرادنتا تھا تو دوسرا بااثر گروہ اپنے انقلابی مقاصد کی ترسیل میں غزل کی نارسائی کا گلہ مند تھا۔ اس فضا میں جب ناصر کاظمی کی غزل کی لَے تیز ہوئی تو غزل گوئی کو پھر سے قبولِ عام نصیب ہوا۔ شہرت بخاری کے مطابق ''بحیثیت شاعر ناصر کی شہرت کا آغاز ۱۹۴۲ء کے ایک مشاعرے سے ہوا جس میں اختر شیرانی، عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، ڈاکٹر تاثیر اور عابد علی عابد جیسی معروف ہستیاں بھی شریک تھیں۔ (۱)'' اسلامیہ کالج لاہور کا نوجوان طالب علم ناصر کاظمی ''غزل پڑھ رہا تھا اور اس کے ہم سن حیرت اور رشک سے اسے دیکھ رہے تھے...... اور جب یہ شعر آیا:

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

تو عابد صاحب پر ایک خاص قسم کے اضطراب کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بلند آواز سے کہا: ''پھر پڑھو...... اسے پھر پڑھو......''

جب یہ شعر پڑھا گیا:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

تو عابد صاحب پر وجد طاری ہوگیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوگئے، پھر بیٹھ گئے اور زانوؤں پر ہاتھ مار مار کر بار بار پڑھنے کے لیے کہتے رہے۔ ایک عابد علی عابد اور ڈاکٹر تاثیر ہی پر منحصر نہیں تھا، اسلامیہ کالج کا یہ کشادہ کمرہ جہاں یہ تاریخی فرشی مشاعرہ ہو رہا تھا، داد و تحسین کے نعروں سے گونج اُٹھا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا در و دیوار لرز رہے تھے اور جیسے ہر طرف سے کوئی صد رنگ تیز روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی...... لاہور کا شاید ہی کوئی قابل ذکر استاد یا مبتدی شاعر ایسا ہوگا جو اس مشاعرے میں شریک نہ تھا...... اس سے پہلے میں کئی معرکے کے شاعر سن چکا تھا۔ جگر مراد آبادی، ابوالاثر حفیظ، ساغر نظامی اور نازش رضوی کے بے حد دل پذیر ترنم سنے تھے مگر آج حالت ہی مختلف تھی۔ جب وہ غزل پڑھ رہا تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے آج پہلی مرتبہ میں نے کسی زندہ شاعر کو دیکھا ہے...... میرا دل اس کی غزل اور اس کے ترنم کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور جوں جوں غزل آگے بڑھ رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ جب غزل ختم ہوئی تو محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دل پھٹ جائے گا، اس میں مزید دھڑکنے کی تاب نہیں تھی...... گہرا سانولا رنگ، بھرا بھرا ہنستا ہوا چہرہ، موٹی موٹی پرکشش، روشن اور بے قرار آنکھیں، کالی شیروانی، وہ کیسا خوبصورت لگ رہا تھا''

یہ ادبی اور تہذیبی واقعہ قراردادِ پاکستان کے فقط دو سال بعد کا ہے۔ یہ ایک ایسا زمانہ ہے جس میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت یا تو تحریک پاکستان کی مخالفت میں سرگرم عمل تھی یا اس سے لاتعلق تھی۔ محمد حسن عسکری نے اپنے مضمون بعنوان ''مسلمان ادیب اور مسلمان قوم'' میں اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ:

''جب مسلمان عوام پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے تھے اس وقت عام طور سے مسلمان ادیب یا تو پاکستان کا مذاق اُڑاتے تھے یا بے اعتنائی برتتے تھے۔ پھر پاکستان بننے کے بعد مسلمان شاعروں نے پاکستان کا خیر مقدم جس خوبصورتی سے کیا ہے وہ بھی داد کے قابل ہے۔ ہمارے شاعروں کو گلہ ہے کہ ہم نے تو نہ جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے اور تعبیر بالکل اُلٹی ہوئی۔ ابھی ہماری منزل نہیں آئی ہمیں تو بہت دور جانا ہے!''

طلوعِ آزادی کے فوراً بعد محمد حسن عسکری نے پاکستان کے ادیبوں اور دانشوروں پر قیامِ پاکستان کی معنویت آشکار کرتے ہوئے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کے سے سوال اُٹھائے۔ نئے حقائق کی روشنی میں اور نئے گرد و پیش کے تناظر میں ایک نئی دنیا کی تعمیر کا فریضہ یاد دلایا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سعادت حسن منٹو کے علاوہ کسی اور مانے جانے ادیب نے ان نئے حقائق سے آنکھیں چار کرنے اور ان نئے سوالات پر غور و فکر کی زحمت گوارا نہ کی۔ ایسے میں محمد

حسن عسکری کو ناظر کاظمی کا دم غنیمت نظر آیا۔ انتظار حسین نے اپنی کتاب بعنوان ''بوند بوند'' میں ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ناصر کاظمی کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ درج ذیل الفاظ میں کیا:

''بتائے ہوئے وقت پر ایک نوجوان آیا، سانولی رنگت، چھریرا بدن، کالی اچکن۔ عسکری صاحب کا پوچھا میں نے کہا کہ بیٹھ جائیں، آتے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ شخص بے پروائی سے سگریٹ پیتا رہا، میں بے تعلق بیٹھا اپنا کام کرتا رہا۔ عسکری صاحب آئے تو ہم تینوں اُٹھ کر کیفے اور ینٹ میں، جو اَب معدوم ہو چکا ہے، جا بیٹھے۔ وہاں ناصر کاظمی نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ مجھ پر کچھ ان غزلوں نے اثر کیا، کچھ عسکری صاحب کی بے تحاشا داد نے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک نئے شاعر سے متعارف ہوا ہوں۔ اسی نشست میں ناصر نے یہ غزل بھی سنائی تھی:

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

جو عسکری صاحب نے عالم فریفتگی میں وہیں نقل کرائی۔ پھر ۱۹۴۹ء کے آغاز کے ساتھ ساتھ یہ غزل ''ساقی'' میں شائع ہوئی اور ساتھ ہی ''جھلکیاں'' میں اعلان ہوا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسر آ گیا ہے...... مہینوں وہ اپنے کالم ''جھلکیاں'' میں ناصر کی غزل کا، غزل کے بارے میں ناصر کے اُٹھائے ہوئے سوالوں کا تذکرہ کرتے رہے۔''

انتظار حسین نے اپنی کتاب بعنوان ''چراغوں کا دُھواں'' میں ناصر کاظمی پر عسکری صاحب کے ''فدا ہونے'' کی واردات بیان کرتے وقت لکھا ہے کہ اُس زمانے میں عسکری صاحب کو ''ایک سچے پاکستانی شاعر کی اشد ضرورت تھی۔'' ایسے میں ''ناصر کی غزل کیسے صبح وقت پر نمودار ہوئی۔ کیا خوب شاعر دستیاب ہوا۔ میر کا ماننے والا، فراق کا چاہنے والا، غزل کھری، ترقی پسندی کی آلائش سے پاک، فسادات اور ہجرت کا بیان۔ مگر داغ داغ اُجالے کے رنگ سے نہیں بلکہ ایک تخلیقی تجربے کی کیفیت کے ساتھ۔ یہ غزل اس وقت عسکری صاحب کی ساری خواہشات کو قومی و نیز ادبی، پوری کرتی نظر آ رہی تھی۔ سو انہوں نے اسے فوراً ہی لپک لیا۔'' (۵) عسکری صاحب ناصر کی غزل کی تحسین میں حق بجانب تھے۔ پاکستان کے ادبی اُفق پر واقعتاً ایک سچا پاکستانی شاعر طلوع ہوا تھا۔ ناصر کاظمی کی شاعری تحریک پاکستان کے آغاز و ارتقا کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ چنانچہ اس دور میں ناصر کی غزل میں اقبال کی آواز ایک نئے اور منفرد لحن میں سنائی دیتی ہے:

مایوس نہ ہو اُداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبحگاہی
اے منتظرِ طلوعِ فردا
بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اُٹھائیں گے سر
مٹنے کو ہے نازِ کج کلاہی
انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر داد طلب ہے بے گناہی
پھر اہل وفا کا دور ہوگا
ٹوٹے گا طلسم کم نگاہی
آئین جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

درج بالا غزل میں تحریک پاکستان کے خواب و خیال کی عکاسی بڑے مؤثر انداز میں کی گئی ہے۔ دورِ صبح گاہی، طلوعِ فردا، نازِ کج کلاہی کے مٹنے اور خاک نشینوں کے سربلند ہونے کی بشارت، کم نگاہی کے طلسم کے ٹوٹنے کی اُمید اور آئین جہاں کی تبدیلی کے نتیجے میں اوامر و نواہی کے بدل کر رہ جانے کی نوید۔ یہ سب گویا اقبال کے تصورِ پاکستان کی اقبال ہی کی شاعری کی زُبان میں نئی تفسیر و تعبیر ہے۔ ہر چند سن انیس سو بیالیس کے آس پاس کا زمانہ جب رفتہ رفتہ سن انیس سو چھیالیس کے آس پاس کے زمانے سے آ ملا تو چند مسلمان ترقی پسند شاعروں نے بھی پاکستان کے قومی ترانے لکھے اور گائے۔ تاہم ان لوگوں نے بھی قیامِ پاکستان کا خیر مقدم ع ''وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں'' (فیض) اور ع ''ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے'' (ندیم) کے سے اعلانات سے کیا۔

اقبال کے تصور کی یہ نئی دنیا ۱۴ راگست ۴۷ء کو جب قیامِ پاکستان کی بشارت بن کر طلوع ہوئی تو ہمارے ترقی پسند اور جدید ادیبوں نے اسے ملک کی تقسیم اور بٹوارے کی منفی اصطلاحات میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں پاکستان کے قیام کی خوشی کی بجائے برطانوی ہند کی تقسیم کا غم کھائے جا رہا ہو۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے نتیجے میں فقط نقل مکانی کے مصائب اور فسادات کی تباہ کاریاں ان دانشوروں کا پسندیدہ موضوع ہو کر رہ گیا تھا۔ اس موضوع پر بھی انھوں نے اس انداز میں دادِ سخن دی گویا تباہی کے ملبے پہ بیٹھ کر نالہ زنی میں مصروف رہنا ہی فن کا پہلا اور آخری تقاضا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ''طلوعِ آزادی کے جلو میں دو طرح کے افراد پر مشتمل قافلے پاکستان میں وارد ہونا شروع ہوئے تھے۔ ان قافلوں میں ایک تو وہ مبارک ہستیاں ہیں جو اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنے خوابوں کی مسلمان مملکت میں تشریف لائی تھیں۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو پاکستان کے اس مطلب پر تو کبھی ایمان نہ لائے تھے مگر نہرو

کے سیکولر اور سوشلسٹ بھارت میں ہندو انتہا پسند جنونیوں کی غارت گری سے بچنے کی خاطر پاکستان میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پہلی طرح کے لوگ مہاجر جبکہ دوسری طرح کے لوگ پناہ گزیں ہیں۔'' (۶) ان لوگوں نے پرانی اور مکوم دُنیا کی تباہی کے اس ملبے سے ایک نئی دُنیا کی تعمیر کا چیلنج قبول کرنے کی بجائے فقط برطانوی ہند کے بٹوارے پر آنسو بہانا کافی جانا۔ اس کے برعکس ناصر کاظمی نے پرانی دُنیا سے نئی دُنیا کو ہجرت کا تصور اپنا کر اپنی شاعری کے ذریعے ایک نئی دنیا کی تعمیر کے امکانات کو روشن تر کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔

ہجرت کے اس تصور پر ناصر کاظمی کی خالہ محترمہ صغریٰ بی بی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ناصر کاظمی کو ''ابھی بی اے کی ڈگری نہیں ملی تھی کہ پاکستان بن گیا۔ جب ہم نے واہگہ بارڈر کراس کیا تو میرے ابا نے پرچم سبز ہلالی دیکھا اور کہا بیٹا مبارک ہو! تمہیں پاکستان مل گیا۔'' تو میں نے ابا سے کہا تمہیں بھی مبارک ہو۔ تو میرے ابا کہنے لگے کہ تمہیں اس لیے مبارک دے رہا ہوں کہ تم وارث ہو اس زمین کے، تمہیں زیادہ رہنا ہے۔ اس بے سروسامانی میں ایک جینے کی بڑی اُمنگ کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں۔ تو اب پاکستان میں آ کر میں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک دارالاماں مجھے مل گیا ہے۔'' (۷) ناصر کاظمی بھی اپنی ہجرت کی واردات کو میر تقی میر کی ہجرت کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو کچھ اسی طرح کے جذبات میں سرشار ہو کر پکار اُٹھتے ہیں کہ: ''میر اور ان کے رفقاء کی ہجرت اور ہماری ہجرت میں بڑا فرق ہے۔ اُنھوں نے ہجرت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ ہم نے یہ ہجرت خود اختیار کی ہے۔ میر کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت اور تہذیب کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ہم نے ایک نئی ملت اور ایک نئے ملک کی بنیاد رکھی ہے اور اب ہم اس میں زندہ رہنے کے لیے نئی اقدار اور مکمل فلسفۂ حیات کی تلاش میں ہیں۔ میر کا زمانہ رات تھا۔ ہم نے صبح کی روشنی میں آنکھ کھولی۔ نیا سورج ناچ رہا ہے، ہمیں للکار رہا ہے۔'' (۸) اپنے ایک اور مضمون بعنوان ''نئی غزل'' میں ناصر کاظمی ہجرت کی اسی واردات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے وقت پکار اُٹھتے ہیں کہ ''آزادی کے بعد ہجرت کے تجربے نے کئی صورتیں اختیار کیں۔ کہیں تو ہمیں صرف جغرافیائی ہجرت کا تجربہ ملتا ہے لیکن اس سے بھی شدید تر وہ ہجرت تھی جو شاعر کا بنیادی اکیلا پن ہے جسے روحانی ہجرت کہا جا سکتا ہے۔ اس سفر میں غزل نے بھی ہجرت کی۔ یہ ہجرت غزل کی ترقی کا وسیلہ بنی کیونکہ ترقی ہجرت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ عرصۂ حیات میں جو مسائل اور رجحانات بکھرے پڑے تھے، غزل میں اُنہیں چننے اور سمیٹنے کی شاید زیادہ صلاحیت ہے۔'' (۹) اسی طرزِ احساس کی بدولت ناصر کاظمی کے ہاں ہمیشہ ہجرت کے مصائب پر ایک نئی صبح اُمید کا تصور جھلملاتا نظر آتا ہے:

دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے
خوفِ بے مہریٔ خزاں بھی ہے
خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں
آمدِ صبح کا سماں بھی ہے
ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا
ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے

....

دن کا سنہرا نغمہ سن کر
ابلق شب نے موڑی باگ

ناصر کاظمی نے گویا روایت کے خلاف بغاوت کی بجائے روایت کی بازیافت اور احیا کا چلن اپنا کر طلوعِ آزادی کے ساتھ نمودار ہونے والے نئے ادبی اور تہذیبی حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی۔ اُس زمانے میں ہماری ادبی روایت کے باغی ادیب اپنے عصری شعور پر بہت نازاں تھے۔ ایسے میں ناصر کاظمی نے نئی غزل پر اپنے ایک مضمون میں یہ برمحل سوال اُٹھایا تھا کہ ''شاعری عصری شعور بلکہ شعور کے بغیر تو ممکن نہیں لیکن اگر روحِ عصر کسی شاعر کے کلام میں ہے بھی تو سوال یہ ہے کہ روحِ ماضی اور روحِ مستقبل بھی اس کے ہاں ہے یا نہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ روحِ عصر میں روحِ ماضی اور روحِ مستقبل شامل ہوتی ہے۔'' (۱۰) اپنے ایک اور مضمون بعنوان ''میرا ہم عصر'' میں ناصر قرآن حکیم کی سورہ والعصر کی روشنی میں ہم عصریت کی معنویت سمجھنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس باب میں ان کا کہنا یہ ہے کہ ''میں لفظ عصر کے قرآنی معانی پر توجہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اب اگر سلیم احمد صاحب یہ اعتراض کریں کہ میں ادب کے معاملے میں قرآن مجید کو بیچ میں کیوں لاتا ہوں تو میری گزارش یہ ہے کہ میں قرآن کو ادب سمجھ کر پڑھتا ہوں اور اپنی زبان کے بعض لفظوں کے اصل معانی پر بھی زور دیتا ہوں کہ دورِ غلامی میں ہماری قومی علامتوں کا اس قدر مذاق اُڑایا کہ اب ہم ہر معاملے میں اہلِ مغرب کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ برطانوی حکومت کے دور میں ہماری قومی اور ادبی روایات کا جو حال ہوا وہ ایک دُکھ بھری کتھا ہے۔'' (۱۱) طلوعِ آزادی کے ساتھ ہی ناصر کاظمی نے بڑی دردمندی کے ساتھ قومی علامتوں اور ادبی روایات کے احیاء کے عمل کا آغاز کیا تھا۔

ناصر کاظمی کی غزلیات کا پہلا مجموعہ یکم جنوری سن

انیس سو چوّن میں ''برگ نَے'' کے عنوان کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ کتاب کے ابتدائیہ میں ناصر کاظمی نے ہماری اُس قدیم اور بڑی حد تک متروک شعری روایت کی تحسین کی تھی جس کے ''ذریعے بھرتی کا رشتہ آسمانوں سے جا ملتا تھا''۔ ''برگ نَے'' کی ترکیب کے تلازمات ہمیں مولانا رومی (بشنو از نَے ......) سے لے کر علامہ اقبال (کوئی دیکھے تو میری نَے نوازی) تک ارتقا پذیر اپنی شعری اور فکری روایت کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ناصر کاظمی کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے کہ یہ زمانہ اس شعری و فکری روایت سے بغاوت پر نازاں ہے جبکہ ناصر کاظمی ''برگ نَے'' کے اسی ابتدائیہ بعنوان ''اعتبارِ نغمہ'' میں اس باغیانہ انداز کو درج ذیل الفاظ میں طنز کا نشانہ بناتے ہیں:

''دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن بھی سکتی ہے یا نہیں؟ محض ہزاروں کا ذکر کرنے یا ہزاروں کو مخاطب کرنے سے اُن کی دھڑکنیں اور اُن کی لرزشیں ساز کی ہم نوائی نہیں کر سکتیں۔ نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا۔ نالہ آفریں پر جو کچھ بھی گزری ہو اُس کی فریاد فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ و پکار ہے۔''

طنز کی یہی کاٹ درج ذیل غزل میں بھی موجود ہے جس میں ناصر کاظمی نے اپنی نسل کے ظہور سے پیشتر دادِ سخن دینے میں مصروف جگر، فراق، فیض، قیوم نظر اور یوسف ظفر کے سے نامور شعراء کو اُن کے شعری مجموعوں کا نام لے لے کر رد کیا گیا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

پھر سرِ صبح وہ قصہ چھیڑا
دن کی ''قندیل'' بجھا دی ہم نے
آتشِ غم کے شرارے چُن کر
آگ ''زنداں'' میں لگا دی ہم نے
رہ گئے ''دستِ صبا'' کملا کر
پھول کو آگ پلا دی ہم نے
''آتشِ گل'' ہو کہ ہو ''شعلہ ساز''
جلنے والوں کو ہوا دی ہم نے

سرکردہ ترقی پسند اور جدیدیت پسند شاعروں کے فکری مسلک کی اس نفی کے بعد ناصر کاظمی نے اپنے کارنامۂ فن کا اثبات یوں کیا ہے:

کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینۂ نَے میں چھپا دی ہم نے

میں جب ''کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا'' کا خیال کرتا ہوں تو مجھے مسلمانوں کا فلسفۂ عشق یاد آتا ہے جس کی رُو سے ارضی اور بظاہر حقیقی محبت فقط علامتی اور مجازی ٹھہرتی ہے اور خالق اکبر سے انسان کی بظاہر علامتی محبت حقیقی قرار پاتی ہے۔ حقیقت اور مجاز کا یہی فلسفۂ عشق ناصر کاظمی کے مجموعہ کلام ''پہلی بارش'' میں وارداتِ عشق کا حاصل ہے۔ ناصر کاظمی کے ہاں رنگِ میر کو اوّل اوّل میر پرستی سے تعبیر کیا گیا تھا۔ مگر بعد ازاں جب میر تقی میر کی شاعری پر اُن کا مقالہ شائع ہوا تو کھلا کہ میر کے کلام سے اُن کا شغف فی الحقیقت مسلمانوں کی تہذیب کے بنیادی تصورات سے اُن کی وابستگی کا کرشمہ ہے۔ ناصر کاظمی نے ''میر ہمارے عہد میں'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں پہلی بار میر تقی میر اور علامہ اقبال کے درجنوں ہم معنی اشعار کو آمنے سامنے رکھ کر ہر دو شاعروں کے فلسفۂ حیات میں یکسانیت کی درج ذیل الفاظ میں نشاندہی کی ہے:

''اقبال اپنے بنیادی فلسفۂ حیات میں میرؔ سے کس قدر قریب ہیں؟ کلیات میرؔ کو بھی دیکھ لیجیے۔ وہاں میرؔ صاحب کے ایسے سینکڑوں اشعار ملیں گے جن میں فلسفہ اقبال کے بنیادی عناصر تہ در تہ سمٹے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ یہ تو مسلمانوں کے بنیادی تصورات ہیں اور پھر اقبال نے یہ باتیں میرؔ سے نہیں لیں بلکہ فارسی اور عربی روایات سے اخذ کی ہیں مگر یہ بھی دیکھئے کہ میر صاحب کی نظر انتخاب بھی انہیں بنیادی قدروں پر کیوں پڑی؟'' (۱۳)

مزید برآں:

''میر کو نہ تو ویسا سازگار ماحول ملا اور نہ ہی اُن کے زمانے میں تحصیل علم اور وسیع دنیا کے سیر و سفر کے وہ مواقع بہم تھے جو اقبال کو میسر تھے مگر یہ کہنا کہ میر صاحب کے دل میں قوم کا درد نہیں تھا، ان کی شاعری محض ذاتی دُکھوں کا رونا ہے، بے بصیرتی ہے۔ میر صاحب کے سامنے کوئی زندہ معاشرہ تھا ہی نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر ولولۂ تازہ لے کر میدان میں آتے۔ انہوں نے مرنے والوں پر آنسو بہائے اور جو مر رہے تھے اُنہیں کبھی رُلا کر کبھی ہنسا کر کبھی غیرت دلا کر ان کی کمزوریوں سے آگاہ کیا۔ مگر وہ اپنی قوم سے مایوس بھی نہیں تھے:

یوں تو ہم عاجز ترینِ خلقِ عالم ہیں و لے
دیکھنا قدرت خدا کی گر ہمیں قدرت ہوئی (۱۴)

گویا ناصر کاظمی کی نام نہاد میر پرستی مسلمانوں کے عہد در عہد سفر کرتے ہوئے بنیادی اصول و اقدار سے تخلیقی وابستگی سے عبارت ہے۔ چنانچہ ناصر کاظمی نے میر تقی میر کو اپنے عہد کا شاعر اور یوں اپنا ہم عصر قرار دیا ہے۔ اسی طرزِ فکر و احساس کی بدولت ناصر کاظمی کی غزل ''برگِ نَے'' اور ''دیوان'' سے ہوتی ہوئی ''پہلی بارش'' تک پہنچتے پہنچتے ''حرف بازناں گفتن'' اور حرف باز ماں گفتن کے مراحل طے کرتی ہوئی حرف با خدا گفتن کی منزل تک آ پہنچی۔ سہیل احمد

خاں کے بقول ''پہلی بارش اُردو غزل میں ایک دل پذیر اور انوکھا تجربہ ہے۔ ہماری غزل میں اس طرح کی واقعاتی اور بیانیہ غزل اس پھیلاؤ کے ساتھ دیکھی نہیں گئی اور امیجز کا اس طرح کا استعمال اس تسلسل کے ساتھ نہیں ہوا۔'' (۱۵) ڈاکٹر سہیل احمد خاں مرحوم کے خیال میں ''ناصر کاظمی کی شاعری کے نواح میں ''پہلی بارش'' تجربے کا ایک نیا شہر ہے۔ اصل شہر کی توسیع لیکن اپنی طرز میں الگ تھلگ'' (۱۶) ایک ہی بحر میں لکھی گئی چوبیس غزلوں پر مشتمل یہ سلسلہ خیال ہمیں اپنے بہاؤ میں لیے مجاز کی قلم رو سے حقیقت کی اقلیم میں پہنچا دیتا ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ہم پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ عشق کا مقصود فقط عرفانِ ذات ہے۔ چنانچہ مَن و تو کے درمیان یہ مکالمات ہمیں گردو پیش کی دُنیا میں ہی ماورا کا جہاں بھی اپنا جادو جگانے لگا۔ چنانچہ ''پہلی بارش'' میں حقیقتِ مطلق کا جیتا جاگتا عکس لرزاں ہے۔ پہلی غزل میں ہی ''میں'' اپنے ''تُو'' سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

مَیں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا
میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جنّ و مَلک نے سجدہ کیا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں تیرے درشن کا پیاسا تھا

کتاب کی اس پہلی غزل کا حمدیہ لحن مجھے اسلامی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ درج بالا اشعار میں تخلیقِ آدم سے متعلق قرآنی آیات کی وہ نئی تفسیر و تعبیر یاد آتی ہے جس کی بدولت انسانی عظمت اور انسانی ارتقاء کے جدید تر تصورات کی اساس قصص القرآن سے ماخوذ قرار پائی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے پہلی بارش کو بجا طور پر ''تجربے کا ایک نیا شہر'' کہا ہے۔ اس شہر کے کوچہ و بازار اور در و دیوار مجاز نہیں بلکہ حقیقت کے ترجمان ہیں۔ اس شہر کے مضافات کی فضا کا ''ہر ذرّہ ایک محملِ عبرت ہے'' اور اس کی ''ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت'' مظاہر فطرت یہاں انسانی اوصاف سے متصف ہیں۔ اس فضا میں اقبال کی شاعری میں انسان اور خدا کے درمیان مکالمات رہ رہ کر یاد آتے ہیں اور اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کی تنہائی کی معنویت آشکار ہوتی ہے:

چھوڑ گئے جب سارے ساتھی
تنہائی نے ساتھ دیا تھا
سُوکھ گئی جب سُکھ کی ڈالی
تنہائی کا پُھول کھلا تھا
تنہائی میں یادِ خدا تھی
تنہائی میں خوفِ خدا تھا
تنہائی محرابِ عبادت
تنہائی منبر کا دِیا تھا
تنہائی مرا پائے شکستہ
تنہائی مرا دستِ دُعا
وہ جنت مرے دل میں چھپی تھی
میں جسے باہر ڈھونڈ رہا تھا

اب ناصر کاظمی تحیرِ عشق کی اُس واردات سے دوچار ہیں جو ''نہ وہ مَیں رہا نہ وہ تو رہا'' فقط جذبہ عشق باقی رہ گیا سے عبارت ہے۔ اس واردات کا حاصل یہ نکتہ عرفان ہے کہ جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش کہیں خارج میں نہیں بلکہ خود عاشق کے دل میں پنہاں ہے۔ آخری تجزیے میں عاشق کا مقصود نہ مجاز ہے اور نہ حقیقت بلکہ فقط عرفانِ ذات ہے۔ یاد کیجیے علامہ اقبال:

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت کو تماشا بن گیا میں

یہ ہے مسلمانوں کے رفتہ و گزشتہ ادوار کی وہ ''گم شدہ نوا'' جس کی بازیابی ناصر کاظمی کی نئے نوازی کا حاصل اور ہماری عصری شاعری کا سرمایۂ افتخار ہے۔

جب ناصر کاظمی اپنی آنکھوں میں ''رفتگاں کے خواب اور مستقبل کا سورج'' لے کر ہمارے ادبی اُفق پر طلوع ہوئے تو محمد حسن عسکری نے بڑے والہانہ پن کے ساتھ اُنہیں اپنے حلقہ اثر میں لینے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عسکری صاحب نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کے موضوع پر ہنگامہ بحث گرم کر رکھا تھا۔ محمد حسن عسکری تو بہت جلد اس بحث کو تشنہ تکمیل چھوڑ کر فرانسیسی ادب کی سیاحت کو نکل گئے اور بالآخر اس سیر و سیاحت سے تھک ہار کر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں آ مقیم ہوئے مگر ناصر کاظمی ایک نئے طرزِ احساس کے ساتھ تخلیقی سطح پر سرگرمِ کار رہے۔ جب عسکری صاحب نے ادب میں جمود کے اعلانات داغنا شروع کیے تو ناصر کاظمی نے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے ہماری ادبی دُنیا کی توجہ ادیبوں کی نئی نسل کے طرزِ فکر و احساس کی جانب مبذول کرائی۔ انتظار حسین نے لکھا ہے کہ:

''ادھر رات کے یہ مسافر تخلیق کے جذبے سے سرشار پھرتے تھے ادھر عسکری صاحب ادبی جمود کی سناونی سنا رہے تھے۔ تو ان یاروں کے بیچ یہ سوال اُٹھنا ہی تھا کہ یہ عسکری صاحب کس ادبی جمود کی بات کر رہے ہیں۔ جو لکھ رہا ہو، تخلیقی اُمنگ لیے پھرتا ہو وہ کیسے مانگے گا کہ ادبی جمود ہے۔ یاروں نے کہا کہ

شاید وہ نسل جس کے ساتھ عسکری صاحب جوان ہوئے تھے جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ مگر ہم تو نئی نسل ہیں۔ پاکستان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہم نے ادب میں آنکھ کھولی ہے۔" (۱۷)

یہی وہ وقت ہے جب ناصر کاظمی نے پاکستان کی نئی نسل کی ادبی اور تخلیقی شخصیت کو روشناس کرانے کی باقاعدہ تنظیمی مہم کا آغاز کیا تھا۔ انتظار حسین نے اپنی اس کتاب کے اسی باب میں ناصر کاظمی کی ڈائری سے درج ذیل ورق نقل کیا ہے:

۲۲ مئی ۵۳ء

پاک ٹی ہاؤس میں "بزمِ اقبال" کی بنیاد رکھی

یکم جون

"تحریک خیال" کی تجویز پر غور۔

۲ جون

تحریک خیال کی بنیادی کمیٹی کا اجلاس۔ شیخ صلاح الدین صاحب صدر، احمد مشتاق خزانچی، انتظار حسین

سیکرٹری، حنیف رامے اور شاکر علی نے بھی شرکت کی۔

۳ جون: ٹی ہاؤس میں نئی نسل کے لکھنے والوں کا اجتماع

۴ جون: شیخ صاحب نے منشور پیش کیا۔

۱۱ جون: Heat Wave, Art Wave & Palmistry میٹرو میں رات کے بارہ بجے تک حنیف رامے کی صدارت میں تحریک خیال کمیٹی کا اجلاس۔ یہ غزل کہی "چاند جب پہلی رات کا دیکھا"

یہ شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مصور اور خطاط اپنے اپنے تخلیقی انہماک سے وقت بچا کر ادب و فن اور تہذیب و ثقافت کو درپیش مسائل و مشکلات پر خیال انگیز مکالمات بھی تصنیف کرتے رہے۔ اوّل اوّل یہ گفتگو ٹیبل ٹاک کے عنوان سے "ماہِ نو" میں سامنے آئی اور بعدازاں محمد حنیف رامے کی ادارت میں رسالہ "سویرا" میں شائع ہوئی۔ "سویرا" میں شائع ہونے والا سلسلۂ مکالمات بالترتیب "خوشبو کی ہجرت" اور "رفتار کا بدن" کے عنوانات کا حامل تھا۔ ان مکالمات کی شروعات شیخ صلاح الدین اور ناصر کاظمی کے درمیان اُن "خوں ریز" بحث و مباحثہ کی صورت میں ہوئی تھی جن کے موضوع بالعموم دو ہوتے تھے (۱) پاکستانی معاشرے کی تشکیل جدید کے لیے کیا اصول اخذ کیے جائیں؟ اور (۲) حکومت شاعروں اور ادیبوں اور دوسرے فنکاروں کی مدد کیسے کرے؟ مگر بغیر کوئی توقع باندھے میرا موقف یہ ہوا کرتا تھا کہ معاشرے کی تشکیل قرآن حکیم کے دیے ہوئے قوانین اور اصولوں کے مطابق ہی ہو سکے گی۔ ناصر کاظمی کا موقف تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کو نظرانداز کر کے مسلمان کوئی کامیاب معاشرہ تشکیل نہ کر پائیں۔ اس معاملے میں ناصر سیرت محمدیؐ کے گہرے مطالعے کو اوّلیت کا درجہ دیتا تھا۔" شیخ صلاح الدین اپنی اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ناصر بظاہر شیعہ عقیدے کا مقلد تھا مگر دراصل وہ صرف قرآن کے مطابق زندگی گزارنے کا آرزومند تھا اور اُس کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ قرآن پر اُس کی گہری نظر تھی۔" کچھ اور آگے چل کر شیخ صاحب موصوف ناصر کاظمی کے مجموعۂ کلام "پہلی بارش" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "ناصر نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۱ء کے دوران قرآن حکیم کو بار بار اپنی پوری صلاحیتوں کو یکجا کر کے پڑھا اور اُس پر غور اور تدبر اور فکر کیا اور مجھ سے نبرد آزما رہا۔" (۲۱) پاکستانی معاشرے کی تہذیبی حیاتِ نو کے موضوع پر اسی بحث و تمحیص نے بالآخر باقاعدہ مکالمات کی صورت اختیار کر لی۔ شیخ صلاح الدین کو خوب یاد ہے کہ

"ایک دن ڈین میں بیٹھے بیٹھے ناصر کو خیال آیا کہ ہم لوگ جو آپس میں گفتگو کرتے ہیں اس کو اگر کوئی ہم میں سے قلم بند کر لے تو خوب رہے۔ پوری محفل میں اس تجویز کو پیش کیا گیا۔ سب نے تجویز کو پسند کیا۔ ...... کچھ مہینوں کے بعد چوہدری نذیر احمد کے کانوں میں بھنک پڑی کہ ہم نے اپنی گفتگو قلمبند کی ہے۔ ان کا اصرار ہوا کہ مسودہ صاف کر کے انہیں دیا جائے۔ وہ "سویرا" میں اس کو شائع کریں گے۔ حنیف ان دنوں چوہدری نذیر کے ساتھ "سویرا" کی ادارت میں شریک تھا اور دونوں ایک ضخیم نمبر کا اہتمام کر رہے تھے۔ لہٰذا حنیف اور میں نے طے کیا کہ بجائے پہلی گفتگو کے مسودے کو شائع کرنے کے کیوں نہ کسی موضوع پر نئی گفتگو "سویرا" کے دفتر میں قلم بند کی جائے۔ ......اس مکالمے سے ہم سب مطمئن تھے مگر ناصر پھر چاہتا تھا کہ اس کے مسودے پر کئی دن غور کرے۔ آخر اس نے غور کرنے کے بعد مسودہ واپس کر دیا اور تجویز کیا کہ اس کا نام "خوشبو کی ہجرت" رکھ دیا جائے۔"

ناصر کاظمی نے قیامِ پاکستان کو ہمیشہ اپنے اس نئے طرزِ فکر و احساس کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اپنے مقالہ بعنوان "میر ہمارے عہد میں" لکھتے ہیں کہ "قیامِ پاکستان کے بعد ہمیں پہلی بار ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع ملا ہے۔ ۴۷ء کے انقلاب کے ساتھ ہماری بہت سی اجتماعی قدریں اُلٹ پلٹ ہو گئیں۔ اس انقلاب نے ہماری اجتماعی زندگی کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ ہم اپنی بعض بنیادی قدروں اور زبان کے سہارے سے اپنی قدیم روایتوں سے بھی جا ملے اور مغربی علوم اور فنون کے رشتے سے ہمارے لیے نئے اجتماعی مسائل اور نئے نظریات بھی اہم بن

گئے ہیں۔'' (۲۳) اسی نئے طرزِ فکر و احساس کے ساتھ ناصر کاظمی نے قدیم مشرق اور جدید مغرب کے علوم وفنون سے اکتسابِ فیض کر کے پاکستان کی تہذیبی زندگی کی شیرازہ بندی اور احیاء کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے تیسویں سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں ناصر نے پاکستان کے ظہور کی ساعت کی یاد کو یوں تازہ کیا ہے:

''جب ہم نے پاکستان میں قدم رکھا تو ایک بے سروسامانی کا عالم تھا۔ ادیب کے پاس اُس وقت اتنا ہی ساز و سامان تھا جتنا پاکستان کے پاس ساز و سامان تھا۔ اُس وقت اصل چیز ساز و سامان نہیں تھی بلکہ آزاد ہو جانے کا احساس تھا۔ اس احساس سے کچھ خواب وابستہ تھے۔ خواب اُس زمانے میں قوم کی آنکھوں میں بھی تھے اور ادیب کی آنکھوں میں بھی۔ ...... پاکستان کی تاریخ میں دو وقت ایسے آئے ہیں جب ہماری دونوں آنکھیں روشن تھیں۔ سن سنتالیس جب پاکستان قائم ہوا، ستمبر ۶۵ء جب ہم نے پاکستان کی بقا کے لیے جنگ لڑی۔ ہم نے ان زمانوں میں ادب میں بھی آنکھوں کو روشن ہوتے دیکھا اور پوری قوم کو بھی اپنی روشن آنکھوں کے ساتھ قومی جدوجہد میں شامل دیکھا۔ یہی دو وقت تھے جب لوگوں نے محسوس کیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اُوپر والے چند لوگوں کی کارروائی نہیں، بلکہ ہم سب اس میں شریک ہیں۔ شرکت کا یہ احساس اس سے آگے پیچھے کیوں نظر نہیں آتا؟'' (۲۴)

قوم اور ادیب کی یک دلی کی یہ کیفیت ناصر کاظمی کو رہ رہ کر یاد آتی ہے اور وہ اس بات پر کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں کہ ہماری قومی قیادت کی آنکھوں سے تحریکِ پاکستان کے خواب و خیال رفت گزشت ہو چکے ہیں۔ ان کے نزدیک خواب فراموشی کا یہ چلن ہمارے قومی انحطاط کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ہماری قومی زندگی پر اس صورتِ احوال کے منفی اثرات ناصر کی عملی سرگرمیوں کا محرکِ اوّل بھی ہیں اور شاعری کا موضوع بھی۔ سن انیس سو ستر کی یہ غزل اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے:

چند گھرانوں نے مِل جُل کر
کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
باہر کی مٹی کے بدلے
گھر کا سونا بیچ دیا ہے
سب کا بوجھ اُٹھانے والے
تو اس دُنیا میں تنہا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے
تیرے پاؤں تلے سونا ہے
گہری نیند سے جاگو ناصرؔ
وہ دیکھو سورج نکلا ہے

کیا عجب مقطع میں جس سورج کی جانب اشارہ کیا گیا ہے وہ اُس عوامی جمہوری تحریک کا سورج ہو جس کی روشنی میں اُن کی ''بزمِ خیال'' اور ''تحریکِ خیال'' کا ایک رفیق عزیز، محمد حنیف رامے سیاسی محاذ پر سرگرمِ عمل تھا۔ اس غزل کا ایک ایک شعر پکار پکار کر ہمیں اُس عوامی جمہوری تحریک کے محرکات و مقاصد کی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ مثلاً حکمران طبقے کے ''چند گھرانوں نے مل جل کر'' محروم طبقات کے افراد کا حق چھین رکھا ہے۔ اسی طبقے کے افراد نے ''باہر کی مٹی کے بدلے گھر کا سونا بیچ'' ڈالتے رہنے کی خُو اپنا رکھی ہے۔ اس کے مقابلے میں عوام کی بھاری اکثریت معاشی استحصال اور معاشرتی عدم مساوات کے شکنجے میں پڑی تڑپ رہی ہے۔ ناصر ان محروم اور مظلوم طبقات کو بیدار اور اپنے انسانی حقوق کے حصول میں سرگرمِ کار دیکھنے کے تمنائی ہیں۔ یہی تمنا انہیں بالآخر ''حلقہ فکر'' سے ''میدانِ عمل'' میں لے آتی ہے:

یہ بھی آرائشِ ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقۂ فکر سے میدانِ عمل میں آئے
اُٹھ کے اِک بار پلٹ دوں غمِ دُنیا کی بساط
اتنی طاقت تو مرے بازوئے شل میں آئے

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہوں نے فکری و فنی ارتقاء کی اس منزل پر پہنچ کر انجمن ترقی پسند مصنفین کے فکری اور فنی مسلک کو اپنا لیا ہو۔ اس سوال کے جواب میں کہ ''میں کیوں لکھتا ہوں؟'' ناصر کاظمی نے برسوں پہلے لکھا تھا کہ ''میں نے شاعری کو اس لیے اپنایا ہے کہ میں نے زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ اصول وضع کیے ہیں۔ ان اصولوں کو جسم دینے کے لیے میں نے یہی راستہ بہتر سمجھا ہے...... اس فن کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے مجھے فطرت کی تخریبی قوتوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس تعمیر کے لیے توڑ پھوڑ بھی ضروری ہے۔ خیال کی تخلیق بغاوت چاہتی ہے۔ ہر شے سے بغاوت اور یہ بغاوت ایک بہت بڑی تعمیر کی امین ہے۔ (۲۵) ناصر کاظمی نے 'حلقہ فکر' سے 'میدانِ عمل' میں آنے کے اس عزم کی تجدید ایک ایسے وقت میں کی تھی جب وہ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر اکثر صاحبِ فراش رہا کرتے تھے۔ زندگی نے اُنہیں اس عہدِ تخلیق و تجدید میں سرگرمِ عمل رہنے کے لیے دو برس سے بھی کم مہلت دی اور یوں وہ سقوطِ ڈھاکہ کی سناونی سننے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے:

دائم آباد رہے گی دُنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

نذیر قیصر کی شاعری

جمیل یوسف/مری

پچھلے کئی دنوں سے میں نذیر قیصر کی شاعری پر کچھ لکھنا چاہ رہا ہوں۔ کئی بار قلم اُٹھایا مگر کسی لفظ نے ساتھ نہ دیا۔ سمجھ ہی نہیں آئی بات کا آغاز کس طرح کروں۔ اس کیفیت کا اظہار نذیر قیصر کے ایک شعر میں ملتا ہے:

نام سادہ کاغذ پر لکھ کے رہ گئے اُس کا
اس سے آگے کیا لکھتے، کچھ لکھا نہ جاتا تھا

شاعر نے جو نام سادہ کاغذ پر لکھا اس نے کچھ ایسا اثر دکھایا کہ آگے کچھ لکھا ہی نہ گیا۔ مجھ پر اسی طرح کا کوئی اثر نذیر قیصر کی شاعری کرتی ہے۔ جب بھی میں اُس کی کتاب کھولتا ہوں ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی ایسا شعر مل جاتا ہے جس کے ملنے کے بعد میں کھو جاتا ہوں اور حالت وہی ہوتی ہے جس کو میر تقی میر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

نذیر مختصر کی شاعری میں کچھ ایسا جادو ہے کچھ ایسا چھو منتر ہے کہ محسوس ہوتا ہے۔ شعر پڑھنے سے پہلے میں جہاں تھا، اب وہاں نہیں ہوں۔ اردگرد کا سارا ماحول بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ میں کسی ایسی حالت کا ذکر نہیں کر رہا جو ان دیکھی یا ان سنی ہو۔ آپ نے قوالی کی محفلوں میں دیکھا ہوگا، کبھی کبھار کسی شخص کو عالمِ وجد میں حال پڑ جاتا ہے۔ وہ اردگرد کے ماحول اور دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر سرمستی اور بے خودی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ سر دُھننے لگتا ہے۔ بقول عدم:

جو شعر ہمارے سنتے ہیں مستی سے عدم سر دُھنتے ہیں
ہم اہلِ طریقت کی باتیں الہام کی باتیں ہوتی ہیں

....

نذیر قیصر کے شعر پڑھ کر سرمستی و بے خودی میں بے اختیار ہو کر میں ہاتھ پاؤں تو نہیں مارتا، نہ سر دُھنتا ہوں۔ البتہ ایک عالمِ حیرت و استعجاب میں گم ہو جاتا ہوں۔ لگتا ہے کشف کے عالم میں ہوں، کوئی نیا انکشاف ہونے والا ہے۔ آپ ذرا ان شعروں کو پڑھیں:

کاٹ دیتی ہیں شعاعیں مجھ کو
سائے مٹی سے اُگاتے ہیں مجھے

....

کیا سمیٹو گے تم مجھے کہ میں
ٹوٹتے آئینوں کا سایہ ہوں

....

اے غبارِ ہجومِ نقش ٹھہر
چشم کو دیکھنے کی مہلت دے
شب ڈھل گئی، دریچہ کھلا آسمان کا
چمکا فضا میں تیر، اُفق کی کمان کا

....

میں خاکِ بے نوا تھا مگر میرے ہاتھ نے
کھولا علم فضاؤں میں حرف و بیان کا

....

آسماں دیکھوں، پرندے دیکھوں
کبھی اس خواب سے آگے دیکھوں

....

اُبھرا ہے تو جب بھی آئینوں سے
میں تیرا نقاب ہو گیا ہوں

....

میں تیرے لبوں تک آتے آتے
پانی تھا، شراب ہو گیا ہوں

....

ہونٹوں کا لمس اور جدائی کی سرد شام
دو سائے بے لباس تھے جسموں کی آگ میں

....

جب کسی شاعر کا کلام پڑھتے ہوئے اس طرح کے اشعار آپ کا راستہ روک لیں تو پھر تو وہی کیفیت ہوتی ہے۔ بقولِ شاعر:

وہ آئے بزم میں اتنا تو برق نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

حالانکہ چراغ اپنی اپنی جگہ جل رہے ہیں مگر جب چراغوں میں روشنی نہ رہے تو قلم میں روشنائی کہاں سے آئے اور کاغذ پر لفظ کیسے بنے۔ نذیر قیصر کی شاعری پر لکھنے میں یہی مشکل پیش آتی ہے۔ شاعر جو تاثر پیدا کرتا ہے اُسے کوئی اور شخص اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ پھر جن الفاظ میں دوسرے شاعروں پر آسانی سے اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے نذیر قیصر کی شاعری کو بیان کرنے کی سکت ان الفاظ میں نہیں ہے۔ ویسے بھی کسی اچھے شعر کے تاثر کو کوئی اور شخص اپنے الفاظ میں اس طرح بیان نہیں کر سکتا کہ وہی اثر پیدا ہو جو شعر میں ہے۔ نذیر قیصر کے اشعار پر لکھنے میں یہ دشواری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ نذیر قیصر نے اپنے محسوسات کے لیے اظہار و بیان کے بالکل نئے سانچے اور پیمانے ایجاد کیے ہیں، جن کی کوئی مثال اس سے پہلے اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اکثر شاعر اپنے خیالات جذبات اور تصورات کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کہ نذیر قیصر اپنے محسوسات کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً محبوبہ سے اپنے قرب اور اس کے لمس کا اظہار آج تک کسی شاعر نے اس طرح نہیں کیا جیسا کہ نذیر قیصر نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

ہونٹوں کا لمس اور جدائی کی سرد شام
دو سائے بے لباس تھے جسموں کی آگ میں

اور اسی طرح یہ اشعار بھی ہیں:

میں بوند بوند گر رہا تھا خاکِ بے نمود پر
ترے بدن کی شاخ پر کھلا دیا گیا مجھے
شب وصال جسم و جاں میں پھول سے برس گئے
زمیں پہ آسمان سا جھکا دیا گیا مجھے

برس رہی تھی بارش باہر
اور وہ بھیگ رہی تھی مجھ میں

......

میں بوند بوند جلا وصل کے کنارے پر
وہ لہر لہر بدن کروٹیں بدلتا رہا

......

گلاب بہتا رہا خواہشوں کے پانی میں
ہوائیں چلتی رہیں اور دیا مچلتا رہا

......

جما ہوا ہے شعلہ اُس کے ہونٹوں پر
چوم کے شعلے کو مہکانا ہے میں نے

......

ایک دریچہ اور کھولنا ہے اس نے
ایک پرندہ اور اُڑانا ہے میں نے
بہت ہجوم ہے قیصر اُس کے چاروں طرف
لیکن اُس کو گلے لگانا ہے میں نے

......

شعلہ تھا وہ گلاب تھا کیا تھا
پڑ گئے ہیں نشان ہاتھوں میں

......

گرتے جاتے ہیں پھول بستر پر
کھلتا جاتا ہے تھان ہاتھوں میں

......

دونوں مہک سے بوجھل تھے
پھول کھلایا دونوں نے

......

بکھرتا جاتا ہے کمرے میں سگریٹوں کا دھواں
پڑا ہے خواب کوئی چائے کی پیالی میں
دیے کے سامنے وہ سر جھکائے بیٹھی ہے
چمک رہی ہے مری رات اس کی بالی میں

......

میں دیا جلا کے ڈھونڈتا ہوں
رکھ دی ہے کہیں پہ رات اُس نے

......

سو تو جاؤں گا میں اکیلا بھی
جاگنا تیرے ساتھ چاہتا ہوں

کبھی فرصت ملے تو آ جاؤ
تم کو اک شخص سے ملانا ہے

......

کہیں جائے نہ رات گزر سائیں
مرے تن میں چانن کر سائیں

......

نذیر قیصر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو مجموعی تاثر کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر محبت کا شاعر ہے۔ یعنی عشق و محبت کے معاملات کا شاعر ہے۔ عورت سے اپنے تعلق پر اور ہجر و وصال کے معاملات پر اُس نے بہت لکھا ہے۔ مگر یہ وہ تعلق یا عشق نہیں ہے۔ جسے غالب نے ~ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ، کہا ہے۔ نذیر قیصر کے لیے یہ محض چھیڑ چھاڑ نہیں ہے اس کے لیے تو یہ پوری زندگی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ صنف نازک سے تعلق اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس کی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ اوپر درج کیے گئے اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نذیر قیصر کے نزدیک انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ صنف نازک سے اس کا تعلق ہے۔ یہی تعلق اسے بناتا اور بگاڑتا ہے۔

صنف نازک سے تعلق کے بعد نذیر قیصر کے نزدیک انسان کے لیے اہم ترین مسئلہ خالق کائنات سے اس کے تعلق کی نوعیت ہے۔ اس تعلق پر بھی اُس نے کافی اشعار کہے ہیں۔ خدا نے جو کائنات تخلیق کی ہے جو زمین و آسمان بنائے ہیں زمین پر جو پھول کھلائے ہیں جو درخت اُگائے ہیں آسمان کی وسعتوں میں جو سورج چاند اور ستارے چمکائے ہیں بارش سے دھرتی پر جو امرت رس ٹپکایا ہے ہواؤں، آبشاروں، ندی نالوں، دریاؤں اور بارش کی رم جھم سے جو موسیقی پیدا کی ہے سوکھی مٹی پر بارش کی بوندیں برسا کر جس طرح اُسے جگایا ہے مٹی اور بارش اور دھوپ کے ملاپ سے زمین کی تہوں میں روئیدگی اور زندگی کی جو لہر لہر کروٹیں لینے لگتی ہے پہاڑوں، میدانوں، وادیوں، دریاؤں اور سمندروں میں جو وسعت اور خوبصورتی ہے اور ان سب مظاہر کے درمیان جس طرح انسان کو اُتارا ہے اور جس کڑی آزمائش میں اُسے ڈالا ہے ہر زبان میں بڑی شاعری کے موضوعات یہی ہیں اور مذہبی صحیفوں کے موضوعات بھی یہی ہیں۔ نذیر قیصر کی شاعری پڑھتے ہوئے بعض مقامات پر مجھے ایسے لگا ہے جیسے میں بائبل کی آیات پڑھ رہا ہوں۔ وہ گنبدِ خوف سے بشارت کا طالب ہی نہیں بلکہ خود اس کے کلام میں بعض جگہوں پر بشارتوں کی پرچھائیاں اپنی جھلک دکھائی ہیں۔ باقی شاعروں نے بھی ان موضوعات پر لکھا ہے۔ خدا سے کلام کیا ہے مگر نذیر قیصر کی سوچ اور اس کا لب و لہجہ اور اس کا کلام چاہے وہ خدا سے ہو، ہوا سے ہو، رات سے ہو یا چاند سے ہو یا ان سب سے اس کے تعلق کے بارے میں ہو، بڑا مختلف اور حیران کر دینے والا ہے۔ مثلاً اس نے اپنے ایک مجموعے کا نام اپنی غزل کے ایک مصرعے سے لیا ہے ''اے شام ہم سخن ہو''۔ شام سے متعلق نذیر قیصر کے چند اشعار دیکھیں:

شام رُکتی ہے مرے مدفن پر
دفن ہیں مجھ میں زمانے اُس کے

......

بس ایک شام سرِ دشتِ کربلا اُتری
پھر اس کے بعد گھروں سے علم نکلتا رہا

......

آنکھیں رکھ دیں اُس نے گھر کے دروازے پر
شام ہوئی اور خالی رستہ واپس آیا

......

وہ بستر میں پڑی رہی
شام گلی میں کھڑی رہی

......

اے چاند جھک شجر پر
اے شام ہم سخن ہو

شام جب سیر کو نکلتی ہے
دور تک ساتھ جانا پڑتا ہے

بام پر ستارا چاہیے مجھے
شام وہ دوبارا چاہیے مجھے
چراغ، سایہ، دریچہ، آنکھیں
وہ شام تھی داستان جیسی

خدا سے اور عالمِ خاک و آب و باد کے متعلق سب بڑے شاعروں نے لکھا ہے۔ خدا سے اور خدا کی تخلیق کی ہوئی کائنات کے مختلف مظاہر سے باتیں کی ہیں۔ ایک جانب خدا ہے اور دوسری جانب انسان ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع وعریض ناپیدا کنار کائنات ہے۔ یہی مذہب شاعری اور فلسفے کے موضوعات ہیں۔ مذہبی صحائف کا سلسلہ تو کب کا ختم ہو چکا اور فلسفیوں کا حال اکبرالٰہ آبادی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

مگر شعراء کا خدا کے وجود پر صرف یقین ہی نہیں بلکہ یوں لگتا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ اس کی جھلک دیکھی ہے اسی لیے تو وہ خدا سے باتیں کرتے ہیں۔ خدا کے وجود کے بارے میں شعراء کا استدلال سراسر مختلف نوعیت کا ہے۔ کیٹس جب کہتا ہے کہ ''حسن صداقت ہے اور صداقت حسن۔ بس یہی وہ سب کچھ ہے جو تم جانتے ہو اور جو تمہیں جاننے کی ضرورت ہے۔'' تو وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں ہی بات کر رہا ہوتا ہے۔ اللّٰہ جمیل و یحب الجمال کا بھی یہی مطلب ہے۔ حسن ہی ایک ایسا استعارہ ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ سے گفتگو کر سکتا ہے۔ حسن، خیر اور صداقت ہی اللہ کی وہ صفات ہیں جن کے حوالے سے انسان اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اس تعلق کا احساس نذیر قیصر کی شاعری سے قاری کے دل میں جاگ اُٹھتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا اور اس کی تخلیق کردہ کائنات سے محوِ گفتگو ہے۔ شاعر صوفی نہیں ہوتا کہ عرفانِ حقیقت کے بعد اس کے ہونٹوں پر چپ لگ جائے۔ وہ اپنے عرفان اور کشف کا اظہار کرتا ہے۔ نذیر قیصر کے کچھ مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی کا ثبات چاہتا ہوں
میں زمیں پر نجات چاہتا ہوں
حرف تیرے ہیں، صفحے تیرے ہیں
میں قلم اور دوات چاہتا ہوں
کوئی ان لکھا اسم لکھنا ہے
کوئی انہونی بات چاہتا ہوں

میں کیسے گزرتا، راستے میں
دنیا و دیں پڑے ہوئے تھے

جانے کس کنارے پر تم کہیں کھڑے ہو گے
آ رہا ہے میری طرف ایک پھول بہتا ہوا

ساری رات جلتا ہے دور اک دیا قیصر
میری بجھتی آنکھوں سے کوئی خواب کہتا ہوا

کیسے مل جائیں، جدا کیسے ہوں
میں ہوں شعلہ، تو ہوا ہے کوئی

فلک سے لڑتا رہا خاک پر بکھرتا رہا
بہت خراب ہوا میں خدا کے ہونے سے

طاقِ شب میں چراغ سا قیصر
حرف تھا یا کوئی اشارہ تھا

دھوپ اور بارش سے پھلجھڑی بناتا ہے
آسماں بھی شاعر ہے، شاعری بناتا ہے
بوند ہو کہ پتی ہو، حرف ہو کہ مٹی ہو
چھوٹی چھوٹی چیزوں سے زندگی بناتا ہے

ایک میں رات بھر جاگتا ہوں
ایک میرا خدا جاگتا ہے

ایک میں تھا شہرِ بے چراغ میں
اک خدا کی ذات جاگتی رہی
تو نے تیغ سے لہو کی بوند گرائی تھی
میں دھرتی سے پھول اُٹھانے آیا ہوں

اُڑتا ہوا صبح کا پرندہ
مجھ کو بھی رہائی دے رہا ہے

یہ جائے نماز ہے کہ سبزہ
مٹی کو چٹائی دے رہا ہے

یہیں کہیں گُلِ بہشت سا کھلا ہوا تھا میں
یہیں کہیں پہ خاک میں ملا دیا گیا مجھے

اے زمان و مکاں کے مالک
بے طلب اور بے ضرورت دے

طاقِ خوشبو میں شمعِ نقش جلا
موسموں کو نئی شریعت دے

آسماں دیکھوں، پرندے دیکھوں
کبھی اس خواب سے آگے دیکھوں

درخت کٹ چکے بہت، ہوا بکھر چکی بہت
حیات خاک و آب سے کلام کر چکی بہت

صبح کے پردے میں کس کی شکل تھی
کس کرن سے آئینہ اندھا ہوا

جیل کی فصیلوں پر
سایا اُڑتے پنچھی کا

کھڑا ہے آدمی سر پر فلک اُٹھائے ہوئے
اور اس کے چاروں طرف بحر و بر اکیلے ہیں

تحقیق کے زاویے

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

کچھ ہوش سنبھالتے ہی انسان اپنے گردوپیش پر نگاہ کرتا ہے ۔کون، کیوں ،کب ، کیسے ،کہاں اور ایسے ہی کئی سوالات اس کے ذہن میں آتے ہیں ۔وہ ہر لحہ ہر شے کو متجس نظروں سے دیکھتا ہے ۔اسے مسلسل مشاہدات اور تجربات سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عمر بھر اس کی چھان پھٹک میں لگا رہتا ہے یہی تحقیق کا عمل ہے ۔عربی زبان کے لفظ ''تحقیق'' اور حقیقت کا مادہ ایک ہی ہے یعنی حق یا سچائی کی تلاش۔

اگر چہ تحقیق ایک لامتناہی عمل ہے اور قدرے ایک ناخوش گوار عمل ہے مگر اِسے خوش گوار عمل ہونا چاہیے ۔بعض لوگوں نے اسے ایک مشکل اور اکتا دینے والا عمل بنا دیا ہے ۔نتیجہ یہ ہے کہ نئے لوگ شعبہ تحقیق میں آنے سے ڈرتے ہیں ۔بعضے سمجھتے ہیں کہ تحقیق تارک الدنیا لوگوں کا کام ہے ۔راقم نے خود بھی ۱۹۹۲ء میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھا تھا:

''تحقیق کے لئے عمر ساری نہیں تو آدھی پونی ضرور کھپانی پڑتی ہے تب کہیں مصرعہ تر کی صورت پیدا ہوتی ہے ۔اس وادیِ پُر خار سے جو گزرے سو جانے۔''

علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

تحقیق کا جنگل شیروں سے اسی لئے خالی ہو چکا کہ شیروں جیسا حوصلہ باقی نہیں رہا ورنہ جنگل میں شکار تو وافر ہے ۔دوسرے لفظوں میں سوز و ساز رومی رہا ،نہ پیچ و تابِ رازی ۔تحقیق میں جان مار کے جو لذت ملتی ،وہ ہر کسی کے نصیب میں کہاں؟

طالب علموں کے لئے ،تحقیق کی کتابوں میں تحقیق کے معانی و مصادر پر کافی مباحث ملتے ہیں ۔تحقیق کے زاویوں پر بات کریں تو اس کے کئی پہلو اور کئی زاویے ہیں ۔مگر مقصد سب کا ایک ہے یعنی سچائی اور حقیقت کی تلاش۔

اس حوالے سے سید جمیل احمد رضوی کا کہنا بجا ہے:

''تحقیق اس عمل کا نام ہے جس کے ذریعے سے مسائل کے قابلِ اعتبار حل تک پہنچا جاتا ہے اور اس میں منصوبہ بندی اور با ضابطہ طریقے سے معلومات (Data) کو جمع کیا جاتا ہے ۔ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کی توجیہ و تعبیر کی جاتی ہے ۔تحقیق کے ذریعے سے علم کو دریافت کیا جاتا ہے۔''

سچائی یا حقیقت کے کئی زاویے اور کئی پہلو سامنے آتے ہیں ۔ہر شخص ،ہر گروہ یا قوم کی اپنی ایک سچائی ہے اور صداقت کا اپنا ایک معیار ہے ۔اسی طرح کل کی سچائی اور تھی ۔وقت بدلنے کے ساتھ کتنی نئی سچائیاں سامنے آ چکی ہیں ۔تو پھر سچائی کیا ہوئی ؟ کیا سچائی ایک اضافی صفت ہے؟ قاضی عبدالودود کہتے ہیں:

''تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے ۔کوشش کا لفظ ارادۃً استعمال ہوا ہے ۔وجہ یہ ہے کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش کرنا ایک نہیں ہے ۔کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی ۔ناکامی کبھی جزوی بھی ہوتی ہے ،کبھی کُلی ۔ایک امریکی مصنف سٹریل کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ خارجی حقیقت کا وجود نہیں ۔مجھے اس سے انکار نہیں ۔حقیقت موجود ہے ۔یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے پاس اس کے دریافت کرنے کے نامکمل ذرائع ہوں۔

تحقیق محض واقعات جمع کرنے کا نام نہیں دلائل و شواہد اور تجربہ و تجزیہ کے ذریعے نتائج تک پہنچنے کی کوشش ہے ۔اب مندرجہ بالا سوال پر ایک بار پھر غور کیا جانا چاہیے کہ تحقیقی عمل کی مطلوبہ سچائی کہاں ہے؟ اس موقع پر انسانی کاوشوں کی کامیابی اور سر بلندی کے باوجود اظہارِ عجز ہی کرنا پڑتا ہے کہ بہ قولِ اقبال:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

چوں کہ تحقیق کے اصول عقلی ہیں اس لئے دیگر عقلی اصولوں کی طرح تغیر پذیر ہیں ۔چنانچہ نئی سچائی منظر عام پر آنے کے بعد پُرانی سچائی اپنا اعتبار کھو دیتی ہے ۔اہلِ سائنس کے ہاں اس کا چلن عام ہے ۔اردو ادب میں بھی اب یہ روش عام ہو چلی ہے ۔مثلاً حضرت نوشہ گنج بخشؒ (۱۶۵۴۔۱۵۵۲ء) کے ملفوظات منظر عام پر آنے کے بعد اردو کا پہلا شاعر ہونے کا اعزاز اب دکنی شعرا کے بجائے پنجاب کے حضرت نوشہ گنج بخش کے سر سجتا ہے۔

نئی سچائیوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ ،تحقیق کا ایک اور اہم زاویہ ،معلوم حقائق میں اضافہ کرنا بھی ہے ۔مثلاً مولانا محمد حسین آزاد کے بارے ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں کئی ایک حقائق کا اضافہ کر کے انہیں اپ ڈیٹ کیا ہے ۔اسی طر کی ایک کاوش علی اکبر ناطق نے کی ہے ۔انہوں نے

شعبہ اُردو منہاج یونیورسٹی لاہور میں ''مولانا محمد حسین آزاد کے مساکن واسفار'' کے موضوع پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھ کر آزاد کے حوالے سے معلوم حقائق میں کئی ایک اضافے کئے ہیں۔رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''جب بھی ایسی نئی معلومات حاصل ہوں گی جو اصولِ تحقیق کے مطابق قابلِ قبول ہوں تو اسے لازمی قبول کرلیا جائے گا۔خواہ وہ نئی معلومات پچھلے مسلمات کے تکذیب کرتی ہوں یا ان کی مزید تصدیق کرتی ہوں یا اس کی مدد سے اضافے ممکن ہوں۔دریافت کا عمل اسی طرح جاری رہے گا اور ردو قبول کے احکام بھی اسی طرح کارفرمار ہیں گے''

دیگر محققین کی طرح ڈاکٹر ہارون قادر بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''محقق کو کوشش کرنی چاہیے کی ان کی تصنیف و تالیف میں صحت اور بات میں سچائی اور گہرائی ہو۔کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے نہ ہو۔''

تحقیق کی کئی اقسام ہیں۔جن میں سے بیانیہ تحقیق ،تجرباتی تحقیق ،تجزیاتی تحقیق ۔عمرانی تحقیق، تعلیمی تحقیق اور تاریخی تحقیق اہم ہیں۔

بیانیہ تحقیق (Descriptive Research) میں نثر نگاروں ،شاعروں اور عالموں کے احوال وآثار،خطوط ،سروے اور انٹرویوز شامل کئے جاتے ہیں۔اس حوالے سے پروفیسر امجد علی شاکر لکھتے ہیں:

''بیانیہ تحقیق مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات کا وہ باضابطہ مجموعہ ہے جس کے ساتھ مشاہدے کا تجزیہ اور اس سے حاصل ہونے والے اصول بھی شامل ہیں۔مگر اس کا دائرہ کار وہاں رک جائے گا جہاں متغیرات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کا پیچیدہ عمل شروع ہوجائے۔''

تجرباتی تحقیق(Experimental Research) میں ایک متغیر عنصر یا زیادہ کے دوسرے متغیر عنصر یا زیادہ پر اثرات کے حوالے سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس بارے خالد رشید کہتے ہیں:

''ہر تجربے میں دو قسم کے متغیرات سے واسطہ رہتا ہے۔یعنی آزاد متغیرات اور تابع متغیرات۔اس قسم کی تحقیق میں تابع متغیرات کو قابو میں رکھتے ہوئے ،آزاد متغیرات کے ان پر مرتب ہونے والے اثرات تحقیق کا موضوع قرار پاتے ہیں''

اردو زبان بالخصوص شاعری کی کی عمر کم وبیش ایک ہزار سال بنتی ہے مگر تحقیق کے حوالے سے اردو ابھی کم عمر ہے۔شاعری کے حوالے سے اس کی عمر کی تصدیق حضرت امیر خسروؒ کے دیباچہ غرۃ الکمال سے ہوتی ہے۔مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱۔۱۰۴۶ء) کو بالاتفاق اردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔اردو شعرا کے تذکرے تحقیق اور تنقید کی پہلی کڑی سمجھے جاتے ہیں۔یوں تو سبھی تذکرے اپنی ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں مگر فرانسیسی مستشرق ،گارسیں دتاسی کا تذکرہ بہت اہمیّت کا حامل ہے کہ اس میں معلومات کا وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔بہ قول ڈاکٹر امجد علی شاکر:

''گارسیں دتاسی نے تاریخ ادبیات کو جس وسعت میں دیکھا ہے وہ قابل دید ہی نہیں ،قابل داد بھی ہے۔''

سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے تحقیق کا سائنسی انداز اختیار کیا ہے۔سرسید کو دیگر کئی شعبوں کے علاوہ اردو میں سائنسی اور تاریخی تحقیق کا بھی امام سمجھا جاتا ہے۔پنجاب بالخصوص لاہور میں ، قیام پاکستان سے قبل تحقیقی اور سائنسی شعور بیدار کرنے میں ڈاکٹر لائٹنر ،مولانا آزاد،مولانا حالی اور ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی کا گراں قدر حصہ ہے۔آخر الذکر کو اردو تحقیق کا معلم اول کہنا بجا ہے۔امتیاز علی عرشی نے تحقیقات غالب میں بڑا نام پایا ہے۔قاضی عبدالودود کے ہاں کڑا تحقیقی معیار ملتا ہے۔مالک رام بھی ایک اچھے محقق ہیں۔رشید حسن خاں نے باغ و بہار اور فسانہ عجائب کے علاوہ کئی اہم کلاسیکی کتب کو اعلیٰ تحقیقی و تدوینی پیمانے پر مرتب کیا ہے۔اردو املا پر ان کی کتاب خاصے کی چیز ہے۔پروفیسر نذیر احمد ایک ماہر لغات و مخطوطہ شناس مانے جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد،اردو تحقیق کے شعبہ میں نمایاں کام ہوا ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی نے مخطوطہ شناسی اور تحقیق وتدوین میں دبستان پنجاب کے معیار کو قائم رکھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے دکنی ادب پر گراں قدر تحقیقی و تدوینی کام کیا ہے۔ان کے استاد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں تصوف کے علاوہ دوسرے پہلوؤں پر بھی داد تحقیق دی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر ابوالالیث صدیقی نے دبستان کراچی نے کے تحقیقی معیار کو سربلند کیا ہے۔تاریخی اصول پر ان کی مرتب کردہ اردو لغت ایک بڑا کام ہے۔مولانا غلام رسول مہر،شیخ محمد اکرام اور اکرام چغتائی نے بھی تحقیق میں عمدہ کام کیا ہے۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنے دادا کے مقابلے میں کم مگر معیاری کام کیا ہے۔پنجاب یونیورسٹی لاہور میں 'تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند' کی تحقیق وتدوین ایک عمدہ کام ہے جس کو ڈاکٹر خواجہ زکریا نے نظر ثانی کے بعد مزید ثروت مند بنا دیا ہے۔پنجاب (پاکستان) کے دو بڑے ہمسایہ اداروں پنجاب یونیورسٹی اور گونمنٹ کالج یونیورسٹی کے شعبہ ہائے اردو میں تحقیق وتدوین کی اعلیٰ روایات قائم ہو چکی ہیں۔بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان،اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور،گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، پشاور یونیورسٹی ،نمل یونیورسٹی اسلام آباد اورمنہاج یونیورسٹی لاہور میں تحقیق و

تدوین بالخصوص سندی تحقیق کے حوالے سے اعلیٰ، درمیانہ اور ادنیٰ، ہر سطح کا کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں، بیسویں صدی میں، جہاں دکنی دبستانِ تحقیق اور لاہوری دبستانِ تحقیق کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، وہاں اکیسویں صدی میں دیگر اصناف نظم و نثر کی طرح، پاکستانی دبستانِ تحقیق کے اپنے نقوش بھی واضح ہو رہے ہیں۔ یہ بھارتی دبستانِ تحقیق سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عطاءاللہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک پاکستان میں ادبی تحقیق کے نمایاں رجحانات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں صحیح متن، مشاہیرِ ادب کے سوانحی حالات اور تصانیف کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مختلف اصنافِ ادب اور لسانیاتی مطالعے محققین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں''

تحقیق کے بیسوؤں زاویے (بل کہ بدلتے ہوئے زاویے) محققین کا مرکزِ نگاہ بنتے ہیں۔ اسے کئی ان دیکھے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے موضوع کے انتخاب کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ میرے خیال میں موضوع کا انتخاب اور جیون ساتھی کا انتخاب، دونوں ہی مشکل ہیں۔ جو موضوع (یا ساتھی) ایک بار لے لیا پھر عمر بھر اس کے ساتھ نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر موضوع یا ساتھی لے کر کچھ عرصہ کے بعد اسے بہ وجوہ چھوڑنا پڑے تو کیفیت ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' کی سی ہو جاتی ہے۔ بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑنا بڑی خجالت کا باعث بنتا ہے۔ سندی تحقیق کے لئے تیار کئے گئے اور بہ وجوہ مسترد کئے گئے خاکہ جات /Synoposis کے محققین بین کرتے پائے گئے ہیں۔

تحقیقی موضوعات بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ حصولِ سند کے لئے یا پھر اپنی پسند اور ضرورت کے تحت۔ مغرب میں تحقیقی مقالات کے لئے Thesis اور Treatise کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ تحقیقی موضوعات کسی نہ کسی سوال یا مسئلہ کو لے کر چلتے ہیں اور اس کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ گیان چند جین نے تحقیقی موضوعات کی دس اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً کوئی ایک ادیب (یا شاعر)، صنفِ ادب، رجحان، تحریک، دبستان، علاقائی گروہی جائزہ، کوئی انجمن یا ادارہ، کسی ایک کتاب کا جائزہ (یا ترجمہ)، تدوینِ متن، ادبی حوالہ جاتی کتابیں، بین العلومی تحقیق اور ادبی لسانیات وغیرہ

زندگی کے دیگر اطوار کی طرح اردو زبان و ادب کے موضوعات میں بھی، ہر دور میں کوئی نہ کوئی فیشن حاوی رہا ہے۔ دیگر فیشنوں کی طرح تحقیق کا فیشن بھی بدلتا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ 'دکن میں اردو' کے بعد 'پنجاب میں اردو' لکھی گئی۔ پھر سندھ میں اردو، بلوچستان میں اردو اور بنگال میں اردو شائع ہوئیں۔ اس طرح علاقوں کے سابقوں سے ''۔۔۔ میں اردو'' کا سلسلہ چلتا رہا۔ شخصیاتی عنوانات سے 'احوال و آثار' کا فیشن بھی کئی برس رہا۔ کچھ نئے محققین (اب ریسرچ سکالرز) نے احوال و آثار کی جگہ ''فلاں، شخصیت اور فن'' کو اپنا لیا۔ یہ شخصیت اور فن کا فیشن بھی اب متروک ہوتا جا رہا ہے۔ اکیسویں صدی طلوع ہوئی تو اس کی شامت آ گئی۔ اب متلاشیانِ سند اکیسویں صدی میں اردو ناول، اکیسویں صدی میں اردو غزل، اکیسویں صدی میں اردو نظم اکیسویں صدی میں اردو افسانہ۔ اکیسویں صدی میں یہ۔۔۔ اور اکیسویں صدی میں وہ۔۔۔ وغیرہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

در حقیقت سندی تحقیق کے لئے لکھا گیا مقالہ Thesis/Dissertation تو اولاً سند ہی کے لئے ہوتا ہے۔ پتا تو سند پانے کے بعد چلتا ہے۔ کیا مذکورہ سکالر محض سند لے کر اور مقررہ پانچ دس ہزار روپے الاؤنس لے کر گم ہو گیا ہے یا اس کا شوقِ تحقیق باقی ہے۔ ملک و قوم اور حکومت اسی لئے تحقیق کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ نئے سے نئے لوگ آتے رہیں اور نئی سے نئی راہیں تلاشتے رہیں۔ زبان و ادب کی تحقیق کے لئے مختلف دبستانوں پر، مختلف تحریکات پر، اصنافِ ادب پر، مختلف علاقوں اور اداروں پر اچھا کام ہو سکتا ہے۔ تحقیق اور تدوینِ متن پر بھی کام کی گنجائش موجود ہے۔ مختلف زبانوں کے شہ پاروں کے تراجم کی بھی کافی ضرورت ہے۔

تحقیق اور تدوین میں داخلی اور خارجی زاویے نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ مستند بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مستند بھی۔ یہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی چھان پھٹک کے بعد ہی ان کو قبول یا رد کیا جا سکتا ہے۔ تواریخ زبان و ادب کی کتب، شعرا کے تذکرے بیاضیں، تہذیبی کتب، سفر نامے، روزنامچے، مکاتیب، آپ بیتیاں، اخبارات و رسائل، معاصر تصانیف، انسائیکلو پیڈیا، فرہنگ، تحقیقی ادارے۔ مخطوطات، مسکوکات، ملفوظات، انٹرویوز، دستاویزات، سرکاری ریکارڈ، تاریخ گوئی، سمعی و بصری معاونات اور انٹرنیٹ کو داخلی و خارجی تحقیقی ماخذ اور وسائل تحقیق قرار دیا جاتا ہے۔

تحقیق کے لئے بنیادی ماخذ حد درجہ اہمیّت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ثانوی ماخذ آتے ہیں۔ تجزیے اور استخراجِ نتائج کا دار و مدار انہی پر ہوتا ہے۔ محدثینِ کرام نے تدوینِ احادیث کے لئے اسماء الرجال سے مدد لی ہے جو بنیادی اور ثانوی ماخذ کے تعیّن میں مدد کرتے ہیں۔ ادبی تحقیق میں ادبا و شعرا کی تصانیف اور متعلقہ دستاویزات بنیادی ماخذ ہوں گی۔ مصنف کے مسودے، بالخصوص وہ جن

میں ترمیم و اضافہ و تصحیح کی گئی ہو۔اس کے خطوط، ڈائری، خودنوشت حالات، یادداشتیں، مطبوعہ تخلیقات، میونسپلٹی کا رجسٹر بابت پیدائش و موت، تعلیمی ریکارڈ وغیرہ کو بنیادی ماخذ کی ذیل میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر جین کے مطابق ثانوی ماخذ وہ ہیں جو دوسروں نے مذکورہ ادیب وشاعر کے بارے میں لکھا ہو۔مثلاً مختلف تذکروں، تواریخِ ادب اور انسائیکلو پیڈیا میں اس کے حالات ،اس کے اہلِ خاندان اور دوسروں کے خطوط اور یادداشتیں ،اس کے بارے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی تحریریں اور اس کی غیر ادبی تحریریں وغیرہ (۱۳)

تحقیق میں بنیادی حوالہ ہو یا ثانوی حوالہ، ان کا طریقہ اندراج بھی اہمیّت کا حامل ہوتا ہے۔صرف اردو تحقیق کی بات نہیں بل کہ کسی بھی زبان وادب کی تحقیق کے ابتدائی زمانے میں کوئی خاص طریقہ اندراج نہ تھا۔مصنف کی ذات ہی صداقت کا معیار سمجھی جاتی تھی۔جس کو یقین کرنا ہے، کرے۔نہیں کرنا تو نہ کرے۔اردو میں تحقیق کے معلم اول پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمود شیرانی اور ان کے ہم عصر محققین نے اندراج حوالہ کے جدید طریقے متعارف کرائے جو کہ ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن کے فارمیٹ کے مطابق بنائے گئے تھے۔مثلاً: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام،، ناشر، شہر، سالِ اشاعت، صفحہ نمبر اگر اسی کتاب اور اسی صفحے کا دوبارہ حوالہ مقصود ہو تو ''ایضاً'' لکھ دیا جاتا ہے۔اگر صفحہ نمبر مختلف ہو تو ''ایضاً، صفحہ نمبر'' ڈال دیا جاتا ہے۔اردو تحقیق کے آغاز میں حوالوں کا اندراج رواں عبارت میں نمبر شمار ڈال کر اُسی صفحے کے نیچے حاشیے سے باہر درج کر دیتے تھے جسے فٹ نوٹ بھی کہا جاتا ہے۔اب اس کا رواج کم ہو رہا ہے۔اس حوالے سے قاری دی گئی عبارت کی تصدیق کر سکتا ہے۔

آج کل ایک اور صورت میں بھی حوالے دئے جارہے ہیں یعنی رواں عبارت میں، قوسین میں مصنف کا معروف نام، کتاب کا سنہ اشاعت اور صفحہ نمبر مثلاً (حالی:۱۹۹۰:۴۴) awpr slwn barniT ka Hwlo bhi dikhuy.۔یہ حوالہ فٹ نوٹ میں بھی نمبر شمار کے تحت دیا جاتا ہے مثلاً ہ کے آخر میں اس طرح لکھا جاتا ہے۔۲۔حالی، مقدمہ شعروشاعری، ص۴۴

تحقیقی مقالے کے اندر یا آخر میں حوالہ جات و حواشی لکھنے کے بعد کتابیات/Bibliography بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔اگرچہ سائنسی مضامین کہ جن میں لیبارٹریز میں تجربات کئے جاتے ہیں، اب محض حوالہ جات ہی کافی سمجھے جاتے ہیں، تاہم سوشل سائنسز اور آرٹس سے مضامین میں کتابیات بھی درج کی جاتی ہے۔اس کی صورت کچھ یوں ہوتی ہے:

مصنف یا مؤلف کا معروف نام، باقی نام، کتاب کا نام، ناشر ،شہر، سالِ اشاعت۔ قادر، ہارون، ابجدِ تحقیق۔الوقار پبلشرز، واپڈا ٹاؤن، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

یہ طریقہ ایم ایل اے Modern Language Association کا طریقہ کہلاتا ہے۔اسی کو اے پی اے American Psychological Association/ کے طریقے کے مطابق یوں لکھیں گے۔

قادر، ہارون (۲۰۰۹ء)، ابجدِ تحقیق۔لاہور۔الوقار پبلشرز واپڈا ٹاؤن۔

قابلِ غور بات یہ کہ کتابیات میں ایک مصنف یا کتاب کا حوالہ کا ذکر ایک ہی بار آئے گا مگر حوالہ و حواشی کے ضمن میں ایک سے زائد بار بھی آ سکتا ہے۔پہلے فٹ نوٹ اور پھر کتابیات کی دوہری مشقت سے مقالہ نگار کو بچانے کے لئے ایم ایل اے مینول میں سیلوان بارنیٹ نے ۱۹۸۴ء میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ان تبدیلیوں کے پسِ منظر میں ڈاکٹر محمد عطاء اللہ لکھتے ہیں:

''غالباً سیلون بارنیٹ (Barnet:1996:329) کے اس اقتباس کے بعد ہمیں اس سوال کا تسلی بخش جواب مل جاتا ہے کہ ہم کتابیات مصنف کے آخری نام کی الف بائی ترتیب سے کیوں درج کرتے ہیں۔لیکن کتابیات کے اندراج کا یہ طریقہ تبھی مفید ہے جب حوالہ جدید طریقے سے دیا جائے۔ورنہ اگر تمام تفصیلات فٹ نوٹ میں درج کی جائیں گی تو نہ صرف مقالہ نگار کا وقت ضائع ہوگا اور کمپیوٹر کمپوزنگ میں مشکلات پیدا ہوں گی بل کہ کتابیات درج کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

کمپیوٹر کی آمد کے بعد، یوں سمجھئے کہ اکیسویں صدی کے آغاز سے اب آن لائن حوالے کا رواج بڑھ گیا ہے۔مثلا

www,iqbalcyberliberary.net at 8.30 pm

ہر علم اور فن کی ایک خاص زبان ہوتی ہے۔فن تحقیق کی زبان سادہ اور عام فہم ہونی چاہیے۔یہ معروضی زبان ہوتی ہے، دو اور دو چار کی طرح۔ڈاکٹر امجد علی شاکر لکھتے ہیں:

''معروضیت تحقیق کی بنیادی صفت ہے۔اس لئے اس میں واحد متکلّم کا گزر نہیں۔اردو زبان کے محققین نے تحقیق مغرب سے سیکھی ہے۔۔۔۔اردو نے یہ اصول برطانوی محققین سے لئے ہیں۔انگریزوں کے ہاں فعل مجہول بہت پایا جاتا ہے۔وہ صفحے کے صفحے ایسے لکھ جائیں گے جن میں شاید ہی کوئی فقرہ فعل

معروف(Active Voice) میں ہو۔واحد متکلم تو وہ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔''

گیان چند جین کا نکتہ نظر مختلف ہے۔ان کا خیال ہے کہ ضمیر متکلم کا استعمال کوئی ایسا جرم بھی نہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''تحقیقی مقالے میں بھی کچھ باتیں ضمیر متکلم کے ساتھ لکھنے کی مجبوری آجاتی ہے راقم الحروف اور راقم السطور کتنے مصنوعی اظہار ہیں۔ہم جیسا شاہانہ لفظ استعمال کرنا اردو کی خاکساری کے منافی ہے۔اور اگر یہ کہوں کہ راقم الحروف کو بتائی تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں کوئی کالا چور تو ہوں نہیں جو مجھے اپنی ذات کو سامنے لاتے ہوئے ہچکچاہٹ یا حجاب محسوس ہو''

بہ ہر حال تحقیق کی زبان سادہ اور معروضی ہونی چاہیے۔اس میں ابہام،افسانہ،شاعری،انشاپردازی، طنز وتعریض اور مبالغے کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ محقق کی سادہ زبان کی ایک مثال دن کی روشنی سے ہے۔روشنی بہ ظاہر سفید ہوتی ہے مگر یہ سات رنگوں کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔محقق کی بات سادہ ہو مگر سمجھ میں بھی آنی چاہیے۔اس میں غور وفکر کا سامان بھی ہونا چاہیے ۔ اس حوالے سے قران حکیم کی زبان اور احادیث مبارکہ کی زبان ہماری رہنمائی کرتی ہے۔محقق کو بات کہنے کا ڈھب آنا چاہیے۔اس کا اسلوب بامعنی اور حسبِ حال ہونا چاہیے۔ایک معیار یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ علمی نکات کم سے کم لفظوں میں ادا ہو جائیں۔ایجاز کی یہ خوبی گویا تلخیص نگاری نہ ہو بل کہ متوازن نگاری ہونی چاہیے۔ایک اچھے محقق کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے کیا لکھنا ہے مگر یہ بھی خبر ہو کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔اس سلسلے میں رشید حسن خاں کا ایک اقتباس دیکھیے:

''صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی نے غالب کا دیوانِ اردو شائع کیا ہے۔(آئندہ اس کو'صدی اڈیشن'' کہا جائے گا)مرتب: مالک رام صاحب۔ناشر صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی،دلی۔سال اشاعت ۱۹۶۹ء۔ تدوین کے طلبہ کے لئے زیر بحث نسخہء دیوان غالب کا مطالعہ اس لحاظ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات معلوم ہو کہ کسی دیوان کو کس مرتب نہیں کرنا چاہیے۔اس اڈیشن کے مرتب نے تدوین کے اصولوں کو جس طرح نظر انداز کیا ہے،اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ایک خاص بات یہ ہے کہ مرتب نے اس صدی اڈیشن کی بنیاد دیوانِ غالب کے جس نسخے پر رکھی ہے اور جس کے متعلق یہ دعوا کیا ہے کہ اس کی غلطیوں کی تصحیح غالب نے اپنے قلم سے کی تھی،اور جس کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ نسخہ حیدر آباد کی آصفیہ لائبریری میں موجود ہے۔،وہ نسخہ وہاں موجود ہی نہیں۔''

تحقیق کا ایک منفی زاویہ،آج کل زیادہ نمایاں ہو رہا ہے۔خاص طور سے سندی تحقیق کے لئے لکھے جانے والے مقالات میں طویل ترین تمہیدات اور پس منظری ابواب۔یہ کم وبیش اکثر مقالات میں نقل درنقل لکھے جا رہے ہیں۔چوں کہ لوگ خوگر پیکرِ محسوس ہوتے ہیں اور مقالے کی ضخامت سے مرعوب ہوجاتے ہیں،اس لئے بھرتی کے مال کے ذریعے یہ چکاچوند پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تحقیق میں شاعرانہ اسلوب تحقیق کی خامی سمجھی جاتی ہے لیکن کیا کیجیے کہ چھٹتی نہیں یہ کافرہ منہ سے لگی ہوئی۔ہم مشرقی لوگ خطابت،تکرارِ لفظی اور اسمائے صفات کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں مثلاً عام زندگی میں''لال سُرخ''،''پیلا زرد'' اور اسی طرح دوہری صفات استعمال کرتے ہیں۔تحقیق میں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔انشا پردازی ، رنگیں بیانی ،ناصحانہ اور جذباتی اندازِ بیان شایانِ تحقیق نہیں۔

تحقیق میں جدید ذرائع کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔۔مثلاً جن کتب اور رسائل کے لئے متلاشیانِ علم کتابوں کی دکانوں اور لائبریریوں کی خاک چھانتے تھے، وہ اب آن لائن اور ایک دو کلک کے فاصلے پر موجود ہیں۔اس سلسلے میں مختلف سرچ انجن مثلاً گوگل،یاہو،وکی پیڈیا،ایمازون اور فیس بک ہمیں گھر بیٹھے ہزاروں معلومات مہیا کر رہے ہیں۔شرط یہ کہ آپ کے موبائل میں بیلنس اور وائی فائی کا کنکشن موجود ہو۔

سندی تحقیق اور عمومی تحقیق کے لئے ہائر ایجوکیشن کمشن آف پاکستان(HEC) کی طرف سے جے سٹور(J Store) پر ہزاروں کتب اور معیاری رسائل مہیا کردئے گئے ہیں۔اسی طرح گوگل سکالر ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں کتب اور رسائل پیش کر رہا ہے۔صرف ایک archive.org کی ویب سائٹ پر،علومِ اسلامیہ کے حوالے سے ایک کروڑ چالیس لاکھ کتب موجود ہیں۔تحقیق کا یہ انوکھا زاویہ موجودہ محققین کے لئے ساتوں در کھولتا ہے۔یہاں کُھل جا سم سم سے صدیوں کے بند دروازے کھلتے ہیں۔ایک ایسی کتاب جس کے لئے محقق کو سال ہا سال کے دُکھ بھوگنے پڑتے تھے،اب چند سیکنڈ میں پی ڈی ایف یا کسی اور شکل میں آپ کے کمپیوٹر کی سکرین پر موجود ہوتی ہے۔یہ ناقابلِ یقین بل کہ ہوش ربا حقائق موجود محققین کے لئے راہِ تحقیق کو فرشِ مخمل بنا رہے ہیں۔لالہ وگل سے سجی،وادیِ تحقیق نئے راہروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

عباس تابش کی شاعری میں تشبیہ واستعارہ کی خوبصورتی

ثاقب تبسم ثاقب/گوجرانوالہ

عباس تابش کی غزل فنی اعتبار سے اعلیٰ پائے کی غزل ہے۔ جملہ روایات کے ساتھ ساتھ فنی محاسن سے بھی لبریز ہے۔ ان کی غزل میں غزل کی تمام تر روایات اپنے بھر پور جوبن پر ملتی ہیں۔ کہیں رمز و ایمائیت ہے تو کہیں تمثیل، کہیں زبان کی رنگینی، شگفتگی اور شادابی ہے تو کہیں تخیل کی کار پردازیاں۔ اگر روزمرہ ومحاورات جاندار ہیں تو تشبیہات و استعارات کی جدت وندرت بھی قاری کا دل موہ لیتی ہے۔ ان کے ہاں لطافت ونزاکت اور سنجیدگی ومتانت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایسے جیسے سمندر میں بڑے دریا کا بہاؤ دور تک اپنی لہر کا اثر لے جاتا ہے اور آخر وسیع وعریض سمندر میں مدغم ہوجاتا ہے۔ یہی عباس تابش کا اسلوبِ غزل ہے جو قوسِ قزح کی طرح سے مختلف رنگوں سے مزین ہے۔

عباس تابش نے اپنے آپ کو ایک صاحبِ اسلوب شاعر منوانے کے لئے علم بیان کی کئی اصطلاحات کا استعمال کی ہے۔ جس سے ان کے کلام میں حسن پیدا ہوگیا ہے۔ عباس تابش تشبیہ ،استعارہ، صنائع بدائع، تکرار لفظی، صنعتِ تضاد، تجربات، تلمیحات، سہلِ ممتنع، تخلص، فارسی تراکیب (مشکل پسندی)، مفرس شاعری، چھوٹی بڑی بحور، طویل ردیف، ضرب المثل، استفہامیہ لہجہ جیسی صنعتوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ عباس تابش کی شاعری فنی پختگی، ندرت خیالی اور مقصدیت کے ساتھ ساتھ منفرد اسلوب کی بھی حامل ہے۔ اس سے ان کے کلام کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج یہاں جتنے بھی شاعر موجود ہیں ان کی شاعری کی پہچان کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ عمومی ومجموعی طرز کا لہجہ تو گم ہوکر رہ جاتا ہے لیکن رنگ کا لہجہ اپنی پہچان بنالیتا ہے۔ اگر کلام جداگانہ لذت وسرور کا حامل ہوتو وہ دیگر معاصرین کے کلام سے واضح منفرد نظر آتا ہے اور اپنی شناخت واہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں ایک الگ اور جداگانہ اندازِ سخن دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کا اپنا رنگ ہے ان کے اپنے ساز ہیں۔ اپنی رت ہے، اپنی خزاں ہے، اپنی بہار ہے۔ اُن کی شاعری گنگناتی اور بل کھاتی ہوئی ندی کی طرح وادی سخن میں مسلسل رواں دواں ہے۔ ان کی شاعری دھنک کی مانند ہے جس کے ساتوں رنگ مختلف ہیں۔ اسی جداگانہ رنگ وآہنگ کی بدولت عباس تابش اپنے معاصرین میں واضح طور پر قد آور نظر آتے ہیں۔ شکیل جاذب، عباس تابش کے اسلوب کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"تمہاری غزل روایت کے رچاؤ اور جدیدیت کی تازگی سے عبارت ہے۔ تمہاری غزل کا آہنگ ہی نہیں اس کی فضا بھی جداگانہ ہے پرندوں، درختوں، چاند، دشت اور ہجرت کو تمہاری شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے تمہارا شاعری سے رشتہ بھی ایک درخت اور پرندے کا سا لگتا ہے۔ تمہاری شعری فضا میں رچے ہوئے سب اشعار اردو غزل کا سرمایہ ہیں"۔(۱)

اگر عباس تابش کی غزل کے اسالیب کا فنی جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کسی کلاسیکل استاد کی طرح فنی محاسن اور صناع وبدائع کا نہ ختم ہونے والا وہ سلسلہ ہے جو قاری کو اپنی دل فریبی کے چنگل میں جکڑ لیتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے کلام میں تشبیہ اور استعارہ کے استعمال کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

عباس تابش کی شاعری میں تشبیہ اور استعارہ کی خوبصورتی:

شاعری کو جو چیز نثر سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کے مخصوص فنی محاسن ہیں، جن میں تشبیہ اور استعارہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر شاعر اپنی شاعری کو بہتر اور پرکشش بنانے کے لئے دلچسپ تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتا ہے۔ تشبیہ علمِ بیان کا پہلا اور اہم ترین رکن ہے۔ تشبیہ سے مراد ایک شے کو مشترک صفات کی بنا پر کسی دوسری شے کی مانند قرار دینا ہے۔ سید عابد علی عابد "البیان" میں (تشبیہ) کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تشبیہ کے معنی ہیں جتانا کہ ایک چیز ایک معنی میں بلا تجرید و بلا استعارہ دوسری چیز کی شریک ہے۔۔۔۔ جہاں تک تشبیہ کا تعلق ہے، وائلڈا نے یہ بات وضاحت سے کہہ دی ہے کہ تشبیہ شعری آرائش کا نمونہ ہے، جس کے ذریعے دو چیزوں کی مشابہتوں کو واضح کیا جاتا ہے''۔(۲)

عباس تابش نے تشبیہات کا بڑا ہی خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں لطافت اور حسن کی تازگی پیدا ہوئی ہے۔ ان کی شاعری عمدہ شاعری کی مثال ہے کیونکہ انھوں نے بڑی جاندار تشبیہات استعمال کی ہیں،

؎ تیری مٹھی میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح
میں تری قید میں آزاد ہوا کرتا تھا
(شجر تسبیح کرتے ہیں، ص۱۰۵)

عباس تابش کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے طویل شعری سفر میں تشبیہات کا ستعمال دیکھنے میں آتا ہے۔ ان تشبیہات کی بدولت ان کے کلام کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی ہے۔

؎ دنیا کو تلخ دیکھ کے یوں بدگماں نہ ہوں
تجھ لب کی اور بات ہے انجیر کی قسم
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، مشمولہ عشق آباد، ص۸۴)

؎ تیرے لیے چراغ دھرے ہیں منڈیر پر
تُو بھی اگر ہوا کی مثال آگیا تو بس

عباس تابش نے کئی طرح کی تشبیہات استعمال

کی ہیں، انھوں نے پیڑ، پرندے، در، شمشیر، جنگل، چاند، فلک، ہوا، دشت، حسرت، بام، ستارہ، فلک، گھر اور آسمان جیسی تشبیہات و استعارات استعمال کئے ہیں۔ان کی تشبیہات میں ایسا تاثیری تنوع ملتا ہے جو شعر میں ندرت کاری کو تقویت بخشتا ہے۔انھوں نے پامال تشبیہات سے گریز کرتے ہوئے نئی تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔

خشک پتوں کی طرح ہے قوتِ گویائی بھی
بات کوئی بھی نہیں اور بولتا جاتا ہوں میں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے، مشمولہ عشق آباد، ص ۲۸)

میں برگِ خشک ہوں، ٹہنی سے جڑ نہیں سکتا
درخت کیوں مجھ اپنی طرف بلانے لگے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے مشمولہ عشق آباد۔ص ۵۰۰)

شہزاد نیئر، عباس تابش کی تشبیہات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

'' وہ تراکیب، تشبیہ اور استعارات کے باب میں ندرت و جدت کا اظہار کرتے ہیں تاہم تجربہ کرتے ہوئے خیال کی قربانی انھیں منظور نہیں ۔۔۔۔۔۔ یہ اندازِ تخاطب شعر کی تاثیر گوئی کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے"۔(۳)

تابش کے یہ اشعار دیکھیں کس قدر خوب صورت تشبیہات استعمال کی ہیں:

ہم کہ سوکھے ہوئے پتوں کی طرح تابش
جانے کس وقت نکل جائیں چمن سے اپنے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے مشمولہ عشق آباد، ص ۵۱۸)

چاہیے پرورش مجھے نخلِ بزرگ کی طرح
دشت کے سب پرندگاں میرے لیے دعا کرو
(رقصِ درویش۔ص ۱۰۷)

غزل کے محبوب موضوعات حسن و عشق اور ہجر و وصال کے بیان میں بھی عباس تابش کی تشبیہات منفرد اور جدت سے بھرپور ہیں۔

قیس و فرہاد کو لے بیٹھی ہے دنیا تابش
یہ نہیں سوچتی ہم نے بھی محبت کی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، مشمولہ عشق آباد، ص ۳۰۶)

اُس کی آنکھوں سے لگی برسات کا باعث ہوں میں
شرم آتی ہے مجھے تو حوصلہ دیتے ہوئے
(شجر تسبیح کرتے ہیں، ص ۱۱۸)

عباس تابش کی شاعری میں نادر اور جاندار تشبیہات نے ایک نیا آہنگ پیدا کیا ہے۔

جس طرف سے چاہیں پھوٹ آتے ہیں چشمے کی طرح
ہم پہاڑوں کو نہیں ہے بے زباں ہونے کا دکھ
(شجر تسبیح کرتے ہیں، ص ۱۰۷)

عباس تابش اپنے کلام میں جا بجا تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔جس طرح انھوں نے ایک چیز کی صفات کی مانند دوسری چیز کا استعمال کر کے تشبیہ دی ہے اسی طرح معنی و مفہوم بیان کرنے کے لئے انھوں نے الفاظ ادھار لے کر ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کا سہارا لیا ہے۔ شعری اصطلاح یا علمِ بیان میں جب کوئی لفظ کسی صفت یا خوبی کی بنا پر ادھا لیا جائے اور وہ لفظ اپنے مجازی معنی ظاہر کرے، استعارہ کہلاتا ہے۔استعارہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ استعارے کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہوتا ہے۔ اصطلاح میں استعارے کی تعریف کسی ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے منسوب کرنا ہوتی ہے۔ سید عابد علی عابد اپنی کتاب "البیان" میں استعارے کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

''شاعر پرانے تلازمات کے بندھن توڑ دیتا ہے اور نئے تعلقات دکھا کر ہمارے تجربات کو تازگی، صورت پذیری اور تیز بینی عطا کرتا ہے در اصل استعارے کا تعلق اشیا کو پرانی جیسی خوبصورت ہی عطا نہیں کرتا بلکہ انہیں ہماری امیدوں، رشتوں اور روایتوں کو مضبوط کر کے زندگی عطا کرتا ہے۔'' (۴)

استعارہ غزل کے فنی اور معنوی نظام میں تموج پیدا کرتا ہے۔کسی شاعر کا ذاتی استعاراتی چلن اسے ہجوم سے الگ کرنے کا اولین قدم شمار ہوتا ہے۔عباس تابش نے اپنے اشعار میں خوبصورت لفظ بطور استعارے کے استعمال کئے ہیں۔ پرندوں، درختوں، چاند، دشت اور ہجرت کو عباس تابش کی شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے۔تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم ہیں وہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابش
جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے، مشمولہ عشق آباد، ص ۲۱)

اسی طرح یہ خوبصورت شعر دیکھیں:

روز ہوتی ہے مرے سامنے تازہ ہجرت
روز میں گھر سے نکلتا ہوں مدینے کے لیے
(رقصِ درویش، ص ۲۴)

عباس تابش کے ان اشعار میں استعاروں کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ وہ کوئی بات اشعاروں کنایوں میں بھی کریں تو اس میں بھی ایک ابلاغ کی صورت نکل آتی ہے۔عباس تابش بڑے باکمال شاعر ہیں انھوں نے شجر اور پرندوں کے استعارے جابجا ستعمال کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان دکھ دیتے ہیں، لالچ اور حرص و ہوس میں مبتلا ہو گئے ہیں جبکہ پرندے ان باتوں سے دور رہتے ہیں اس لئے وہ پرندوں سے ایک خاص استعارے کا کام لیتے ہیں۔

شجر سمجھ کر مرا احترام کرتے ہیں
پرندے رات کو مجھ میں قیام کرتے ہیں
(رقصِ درویش، ص ۵۵)

عباس تابش کو پیڑ اور پرندے بے حد پسند ہیں کیوں کہ پیڑ اور پرندے بے وفائی نہیں کرتے ہمیشہ سایہ فراہم کرتے ہیں جبکہ آدمی بے وفا ہوتے ہیں۔وہ انھیں زندگی کی رونق سمجھتے ہیں۔

تم کاٹ نہ دینا اسے بے کار سمجھ کر
اس پیڑ کے نیچے کئی پیمان بندھے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، مشمولہ عشق آباد، ص ۶۳)

نیا پرندہ قفس سے باہر بنا رہا ہوں
میں اپنی مرضی کا پیش منظر بنا رہا ہوں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، مشمولہ عشق آباد، ص ۸۷)

عباس تابش نے استعاروں کے ذریعے اپنے کلام میں کمال مہارت سے حسن پیدا کر دیا ہے۔ انھوں نے استعارات کے لئے اچھے الفاظ کا ستعمال کیا ہے۔ یہ شعر دیکھیں:

نہ تتلیوں جیسی دوپہر ہے نہ اب وہ سورج گلاب جیسا
جسے محبت کہا گیا وہ مغالطہ ختم ہو گیا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا مشمولہ عشق آباد، ص ۳۲۳)

عباس تابش کا استعاراتی نظام بھی ان کے تشبیہاتی نظام کی طرح کافی مضبوط اور توانا ہے۔ انھوں نے کئی الفاظ سے ستعاروں کا فائدہ اٹھایا ہے۔ عباس تابش نے سایہ، دھوپ، گلاب، چاند، قفس، ہنس، پرندے، درخت، کاجل، بادل اور پھول کے استعارات استعمال کئے ہیں۔ اُن کے دوسرے شعری مجموعہ کا نام "آسمان" ہے اور آسمان نارسائی کا استعارہ ہے۔ اس سے عمدہ مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس بات کی وضاحت عباس تابش نے اپنے شعری مجموعے "آسمان" کے پیش لفظ میں "سخن سرائے سے ایک خط" کے نام سے لکھے ایک مضمون میں یوں کی ہے:
''تمھیں یاد ہو گا کہ میں نے جب اپنی نئی کتاب کا نام "آسمان" تجویز کیا تھا تو تم نے کہا "تمہید" کے بعد "آسمان" کیوں؟ آسمان تمہارا نام تھا جو میں نے کتاب کو دے دیا۔ آسمان کی طرف دیکھنا یعنی تمہاری طرف دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں تمہارے لئے بہت سفر طے کر چکا ہوں لیکن تم ابھی بھی تغافل کی بلندی پر ہو۔ چلیے آؤ کہ میں نے نئے مکان میں در، انتظار رکھ دیا ہے"۔ (۵)

چاند چمکا جنگلوں پر آسماں کا در کھلا
یہ عجب قیدی شب تاریک کے اندر کھلا
(آسمان ص ۷۹)

جس شاعر کے شعری مجموعے کے نام ہی میں استعارے کا خوبصورت استعمال گیا ہو، اُس کا استعاراتی نظام بلاشبہ خوبصورت ہو گا۔ یہی استعارے اُن کو صاحبِ اسلوب اور منفرد شاعر بناتے ہیں۔ انھوں نے استعاروں کے ذریعے اپنی زندگی، اپنی ذات اور معاشرے کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ پرندے، اداسی، صحرا، شام، ملال، شب، دعا سمیت درجنوں استعارے ان کی شاعری کے حسن میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں:

میں جب بھی دھوپ کے صحرا میں جا نکلتا ہوں
وہ ہاتھ مجھ پہ دعا کا شجر بناتے ہیں
(تمہید، ص ۸۲)

طلسمِ ظلمتِ شب کا ازالہ کیا کرتا
پرندے سوئے ہوئے تھے میں نالہ کیا کرتا
(رقصِ درویش، ص ۱۱۵)

استعارہ محض استعارہ نہیں بلکہ فکر و خیالات کی ترسیل اور فہم و فراست کا نام ہے۔ ان کی شاعری کا ایک استعارہ ''دعا'' ہے۔ یہ ایک فطری استعارہ ہے۔ انسانی زندگی میں غیر انسانی رویوں، سرمایہ داری کے نظام، دہشت گردی اور غارت گری کے ماحول کے باعث عباس تابش کے یہاں یہ استعارہ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ضیاء الحسن رقم طراز ہیں:
''دعا تابش کی شاعری میں طرزِ عمل بھی، موضوع بھی ہے اور استعارہ بھی۔ دعا فی الاصل واحد پناہ ہے جو انسان کو اس وقت حاصل ہے۔ یہ بے بسی بھی ہے، محبت بھی ہے اور تعلق بھی۔۔۔۔۔ اس دور کی زندگی کو پیش کرنے کے لیے یہ ایک بہترین استعارہ ہے''۔ (۶)

اِک ایک حرف ہو خوش ذائقہ جو تُو چاہے
بہت پھلے مرا نخلِ دعا جو تُو چاہے
(شجر تسبیح کرتے ہیں، ص ۲۵)

ہوائیں پیغام دے گئی ہیں کہ مجھ کو دریا بلا رہا ہے
میں بات ساری سمجھ گیا ہوں مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، مشمولہ عشق آباد، ص ۸۶)

دعا لپیٹ کے رکھ دیں، کلام چھوڑ دیں ہم
تو کیا یہ خوش طلبی کا مقام چھوڑ دیں ہم
(شجر تسبیح کرتے ہیں، ص ۳۳)

کسی شاعر کی شاعری میں جب کوئی لفظ تواتر کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا معانی و مفہوم مسلم ہو جاتا ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں درخت کے گروہی الفاظ مخصوص معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، درخت، شجر، پیڑ، پرندے، طائر اور پتے وغیرہ کے الفاظ تہہ در تہہ معانی اور معنویت کے پردے ہیں۔ یہ اپنے اندر ذیلی مطالب کا ایک جہانِ تازہ رکھتے ہیں۔ درج بالا اشعار میں شجر اور پرندے کے الفاظ بہ طور استعارہ استعمال کیے گئے ہیں۔ عباس تابش کے کلام میں تشبیہ اور استعارات کی ڈھیروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ان کا شعری سفر تیزی سے جاری ہے اور وہ نت نئے انداز میں اس میدان میں اپنی شناخت مضبوط تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کتابیات (حوالہ جات)

۱۔ شکیل جاذب: دیباچہ، عشق آباد (کلیات) لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴
۲۔ عابد علی عابد، سید: البیان، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۳، ۱۱۴
۳۔ شہزاد نیر: ماہنامہ بیاض، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۹۴
۴۔ عابد علی عابد، سید: البیان، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶۱
۵۔ عباس تابش: دیباچہ، آسمان، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵
۶۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر: دیباچہ، شجر تسبیح کرتے ہیں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲

لفظوں کی مہک

سمیرا قیوم

تقریظ و تعارف کا گراں قدر کام تو معروف ادبی لوگوں ہی کا خاصہ ہوتا ہے جو تبصرہ و تنقید کی مہارت میں صاحبِ کمال اور لفظی نگینوں کے جوہری ہوتے ہیں..... لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے..... صرف اس خواہش کے ساتھ کہ'' سچائی کے جو خوبصورت پھول' اولاد کے لیے صحنِ گلشن میں ایک مُشفِق باپ نے سجائے ہیں' انہیں مُرجھانے نہ دیا جائے''۔راقم' رقمطراز ہے۔

آپ جان گئے ہوں گے کہ زیرِ نظر کتاب کے شاعر' جناب عبدالقیوم متخلص بہ زائر' ہم خوش نصیب بچوں کے محترم ابُو حضور ہیں جو پھالیہ شہر کے معزز گھرانے میں پیدا ہوئے اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی۔آپ کے والدِ گرامی جناب میاں محمد شریف مدظلہ العالی' اسم بہ مسمّٰی شرافت' صدق و دیانت کے باعث بہت ہی محترم جانے جاتے ہیں اور جدِ امجد حضرت میاں محمد دین رحمتہ اللہ علیہ' شانِ درویشی اور اِتقاء کے ساتھ ساتھ تمولِ کثیر کی بدولت رئیس اعظم کے نام سے معروف تھے..... جنابِ زائر کا بچپن انہی ہستیوں کے سائے میں ہی گزرا.....

سُنتے ہیں کہ دادا کو اپنے پوتے سے جو خاص اُنس اور پیار تھا' تاحیات رہا اور رُوحانی طور پر وہ نسبت آج بھی تابندہ ہے۔اور ان ہستیوں ہی کی صحبت اور تربیت کا اثر ہے کہ ایک کم گو شخص کے لیے' جو حلقۂ احباب اور اعزّہ و اقارب میں ''چُپ سائیں'' کے نام سے مشہور ہو' تابِ گویائی تک بے تاب ہو گئی۔

جنابِ زائر نے ابتدائی تعلیم مقامی سکول سے حاصل کی اور انٹر گجرات کالج سے پاس کیا۔ازاں بعد باقی تعلیمی سفر پرائیویٹ طور پر طے کیا۔شعبہ تدریس سے منسلک رہے۔ایک ہی ادارہ میں ترقیاں پاتے' آٹھ سال قبل باوقار انداز سے سبکدوش ہوئے۔

اس سے پہلے کہ جنابِ زائر کا شعری سفرنامہ شروع کروں' عرض کرنا چاہوں گی کہ ایک طالبہ تقریر و مضمون نویسی میں جس سے رہنمائی لیتی رہی ہو' وہ اپنے رہبر کی تصنیف اور اس کے قلب ونظر کی کیفیات کا احاطہ کیونکر کرسکتی ہے۔پھر بھی لفظوں کی مہک راہ دکھا دے تو بہت بڑی سعادت ہے۔

راقم الحروف حتمی طور پر نہیں کہہ سکتی کہ جنابِ زائر کیوں' کیسے اور کب اس میدان میں اُترے۔البتہ اتنا ضرور عرض کروں گی کہ ہم گھر کے لوگ بھی، عرصہ دراز کی رفاقت کے باوجود' اُن کے شعر گوئی کے ذوق سے بے خبر رہے ہیں۔لیکن یہ خیال ضرور آتا ہے کہ جو شخص شعری نشستوں میں دیکھا تک نہیں گیا، وہ پھر بھی ادبی حلقوں میں معزز و معتبر جانا جائے تو کوئی بات تو ہے!..... یہ بھید میرے کالج دَور میں تعارفی پروگرام کے لیے آزاد نظم اور ایک مشاعرہ کے لیے طرح مصرع پر ایک غزل تخلیق کرنے پر کھلا..... مجھے نہ صرف حیرت بلکہ بڑی خوشی ہوئی کہ ابو حضور کی' جنہیں ہم معلم اور خوش نویس جانتے تھے، ایک اور خوبی سامنے آئی۔

عرصہ بعد' میرے اصرار پر جنابِ زائر نے بتایا:

''جماعت دہم میں تھا، وداعی پارٹی میں میری لکھی گئی نظم پڑھی گئی جسے بہت پسند کیا گیا اور مجھے اساتذہ کی جانب سے ''چھپے رُستم'' کہہ کر داد دی گئی۔حالانکہ یہ میری پہلی کاوش تھی.....اس کے بعد ایک یا دو شعر کبھی ہو جاتے تو کبھی عرصہ دراز تک خاموشی رہتی۔کسی طرح سے باقاعدگی نہیں رہی ہے۔''

اور..... قارئین کرام! وہ دن ہمیں کبھی نہیں بھولے گا جب گھر کے اندر منعقدہ محفلِ میلاد میں کمال مہربانی سے جنابِ زائر نے پہلی مرتبہ چند نعتیہ اشعار ہمیں پڑھنے کو دیئے۔پہلا شعر ذہن میں اب بھی محفوظ ہے۔

لِلّٰہ بادِ صبا! سُوئے طیبہ تُو جا' والہانہ... حال میرا نبیؐ کو سنانا

رِقت آمیز کلام..... ہم کزنوں کا انداز بھی ویسا ہی ہوتا گیا..... جنابِ زائر کی مضطرب طبیعت نے سبھی حاضرین کی آنکھوں کو اشک بار کر دیا۔

یہ بات میرے لیے بھی باعثِ صد افتخار ہے کہ راقم الحروف ایک نعت گو شاعر کی اولاد ہے اور اسی حوالہ سے میرے خیالات کا گلشن' بہار آفریں خوشبوؤں سے مہکا رہتا ہے۔اسی مہکار نے ہم بہن بھائیوں بالخصوص امّی حضور کی سوچ بدل دی کہ شعر گوئی کے میدان میں رہنا ہی ہے تو کیوں نہ نعت گوئی اختیار کرنے کا مشورہ دیا جائے۔چنانچہ جنابِ زائر کو غزل سے نعت کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔خوش بختی نے ساتھ دیا اور جنابِ زائر مان گئے..... لیکن ابتداء میں اس طرف آتے ہوئے خائف اور گریزاں ضرور رہے۔بقول عزّت بُخاری۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرشِ نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

بالآخر ابو حضور نے ہماری خواہش کے ستاروں کو ماند نہیں ہونے دیا۔

ایک اور خوش گوار حیرت یہ رونما ہوئی کہ جنابِ زائر کتابِ غزل سے ہٹ کر کتابِ نعت کی ترتیب میں مصروف رہتے۔دادا حضور کے ساتھ حالات

حاضرہ کے علاوہ مذہبی و تاریخی موضوعات پر بات ہوتی رہتی تھی..... ایک دفعہ دادا حضور نے نعتیہ شعر سنانے کو کہا۔ جناب زائرؔ نے سلام بحضور حبیبِ کبریاؐ (بہ انداز اعلیٰ حضرت بریلویؒ) دو شعر سنائے۔ دادا جی کی طبیعت پر خوشگوار اثر ہوا' پوچھا "یہ شعر کس کے ہیں؟ کسی نے عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر لکھے ہیں۔"..... جنابِ زائرؔ نے طبعِ مضطرب پر بمشکل قابو پایا اور عرض کی..... "جس گنہگار نے یہ لکھے ہیں وہ آپ کے قریب ہی ہے"..... محبت کی نظر سے اور نظر بھر کے دیکھا' شعر کئی بار سُنے..... اور بچشمِ نم رفعت و سربلندی کی دُعا دی اور کہا..... "لکھ سکتے ہو تو اور بھی لکھو۔"

مختصر یہ کہ "سلام اُنؐ پر" جناب زائرؔ نے والد گرامی کی تحریک اور فرمائش پر مکمل کی اور تاکید پُر زور اور خواہش میں ہم سب کا بھی حصّہ ہے۔ بس کیا تھا، اِدھر بسم اللہ ہوئی اور کچھ ہی عرصہ میں "کتابِ سلام" پایۂ تکمیل کو پہنچی..... اس کے ساتھ ہی ترجیحاً و تبرکاً اسی کی اشاعت پر آمادہ بھی ہو گئے۔

آج ایک انجانی سی مسرت و افتخار کے سائے اپنے اردگرد منڈلاتے محسوس کر رہی ہوں جو نہ صرف ہم سب کے لیے خوشی کا باعث ہیں بلکہ ہم انہیں اُخروی نجات کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ دلی دعا ہے کہ جن آقا کریمؐ کا ذکر بصورتِ کتاب ہمارے ہاتھوں میں ہے اُنؐ کے طفیل ایسا ہی ہو۔ آمین

"سلام اُنؐ پر" کے نام سے ایمان افروز کتاب شائع ہونے کو ہے یقیناً شیدائیانِ حبیبِ کبریاؐ کے لیے ایک نادر تحفہ ثابت ہوگی۔ راقم تبصرہ نگار ہے اور نہ ہی شعر کے محاسن و نکات سے واقف..... تاہم یقین ہے کہ جنابِ زائرؔ کے کلام کے مطالعہ سے قارئینِ کرام کو ان کی عقیدت و لگن کی سمت کا اندازہ بخوبی ہو سکے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص نے حرمین و شریفین کا سفر تک نہیں کیا تھا، وہ ان مناظر و تجلیات کے بارے میں کس قدر محویت کے عالم میں اظہار کرتا ہے۔

جنابِ زائرؔ کا سارا کلام ہی پڑھنے کے لائق ہے البتہ کہیں کہیں عقیدت بھری بے ساختگی اور دلکشی وجد آفریں ہو رہتی ہے..... جی چاہتا ہے کہ "سلام اُنؐ پر" کو وظیفہ ہی بنا لوں۔ کتنی محویت ہے..... عقیدت، محبت اور لطافت کا عالم ہے۔

جس کو دیکھے سے بھرتا نہیں جی کبھی
خوبرُو، خوب سیرت پہ لاکھوں سلام
خیرِ امت کی خاطر ہی سرکارؐ کی
اتنی لمبی مسافت پہ لاکھوں سلام
جالیوں کے قریں، محو تھے جس گھڑی
آمدِ نعت و مدحت پہ لاکھوں سلام
حسرتِ دل سے دیوار و در دیکھنا
پھر مدینے سے رُخصت پہ لاکھوں سلام
جن کو شرفِ حضوری ملے، کہہ اُنھیں
چاہتِ ما بدولت پہ لاکھوں سلام
جن کو عادت نہ تھی جھوٹ کی، کذب کی
اُنؐ کی شانِ صداقت پہ لاکھوں سلام
جو دلوں پر حکومت کے بانی ہُوئے
اُنؐ کے طرزِ حکومت پہ لاکھوں سلام

قارئینِ کرام جب کتاب کا مطالعہ کریں گے وجدانی کیفیات کے زیرِاثر' خیالات کی دنیا میں انوار و تجلیاتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ جمالاتِ مدینہ میں محو ہو جائیں گے.....

آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جنابِ زائرؔ کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے اور اپنے حبیبؐ کے طفیل ہم سب کے لیے اس صحیفۂ سلام کو دنیا و آخرت میں زیادہ سے زیادہ بار آور فرمائے۔ (آمین)

اور اب میں قارئین اور کتاب ہٰذا کے درمیان مزید حائل نہیں رہنا چاہتی... لیجیے بسم اللہ کیجیے!!

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

شاعر، کالم نویس، سفرنامہ نگار، مترجم
اور ماہنامہ "ارژنگ" کے مدیرِ اعلیٰ

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ
شائع ہو گئے ہیں

☆ چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
☆ سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
☆ محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
☆ گفتگو (انٹرویوز)
☆ روبرو (انٹرویوز)
☆ آج کا جاپان (سفرنامہ)
☆ جہاں گردی (سفرنامہ)
☆ محبت کے دو رنگ (تراجم)

ناشر: حسن عباسی
نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0300-4489310

تیری ممتا ہے آسرا میرا

نازبٹ/لاہور

وہ عورت جو گوشت کے چھوٹے سے لوتھڑے میں اپنا خون، اپنی طاقت، اپنی ہمت، اپنی جوانی، اپنا سب کچھ منتقل کر کے اسے طاقتور جوان بناتی ہے خود خالی ہو کر.....ھڈیوں کا ڈھانچہ بن کر بستر پر کیوں پڑ جاتی ہے.....ایسا کیوں ہے میرے مالک!!

یہ ضعیفی کیوں آتی ہے؟؟؟ یہ کیسا سوال ہے جو بری طرح دل چیر رہا میرا.....! یہ ضعیفی کیوں آتی ہے آخر؟؟ اگر آتی بھی ہے تو ضعیفی اور علالت کا یہ ظالم سنگم کیوں میرے مالک؟ ضعیفی تو پہلے ہی بڑی کڑی آزمائش ہے! آخر بچتا ہی کیا ہے بیماری سے مقابلہ کرنے کو....نہ ہمت ، نہ طاقت ، نہ ہی قوت مدافعت! اللہ جی ضعیفی دیتے ہیں تو طاقت اور صحت بھی تو دیجئے نا!

ماں کو تکلیف میں دیکھنا، اولاد کو تکلیف میں دیکھنے سے کہیں زیادہ اذیت دہ.......! لمحہ لمحہ دم توڑتی امیدیں....کبھی جلتی کبھی بجھتی!

ماں کو حوصلہ چھوڑتے دیکھنا، ماں کی ہمت ٹوٹتے دیکھنا، نا قابل برداشت...... پل پل جی کتنا ہے، جیسے..... اپنی ہی سانس بند ہو رہی ہو، اپنا ہی وجود بے جان ہو رہا ہو ماں کو اذیت میں دیکھنا کسی قیامت سے کم نہیں....ماں کی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں اللہ جی!

بچپن اور بڑھاپا ایک ہی دور سے گزر رہے یا شاید بچپن بڑھاپے پر حاوی ہوتا جا رہا ہے، ماں کا چھوٹے بچے کی مانند سسکنا، بلکنا، کراہنا....اُففف میرے اللہ!! اور میرا بے اختیار "میرا شونا بچہ" میرا پیارا بچہ" کہتے ہوئے تڑپ کر ماں کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دینا! ہاں ماں بچے جیسی ہی تو لگ رہی..... چھوٹے بچے جیسی، میری گڑیا جیسی...میری گڑیا سے بھی چھوٹی!!

جی کرتا ماں کو بانہوں میں اس طرح بھر لوں جس طرح ماں نے مجھے پیدا ہونے کے بعد بانہوں میں بھرا ہوگا!! ماں۔موتیے کے پھول جیسی میری ماں، پاکیزہ اور معصوم!

ڈاکٹرز اسٹاف سب مثالیں دے رہے ہیں، حیرت کا اظہار کر رہے ہیں، کوئی کہہ رہا پچیس سال ہو گئے ہم نے کوئی فیملی ایسی نہیں دیکھی جو ماں پر اس طرح جان وارتی ہو، پر یہ سب ایسا کیوں کہہ رہے؟ سب کہتے ہیں ایسا مثالی پیار کہیں نہیں دیکھا....میں حیران ہوں کہ ایسا کیا خاص کر لیا؟ اک لمحہ کا حساب بھی چکتا نہیں کر سکتے ہم!! حق کہاں سے اور کیسے ادا ہو؟ کچھ بھی تو نہ کر سکے ہم، بس نہیں چلتا کہ ماں کو بانہوں میں بھر کے ہر تکلیف ہر اذیت سے بچالوں، چھپالوں۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا امی سے کہ آپ خوش نصیب ہیں کہ اتنی فرمانبردار اولاد ملی ہے "خوش نصیب تو ہم ہیں جنہیں اس قدر محبت کرنے والی ماں ملی" میرے جواب پر وہ بے اختیار کہہ اٹھا کہ "ہم سب رشک کر رہے آپ سب کو دیکھ کر کہ یہاں لوگ ماؤں کو چھوڑ ضرور جاتے ہیں لیکن صرف رسم نبھانے کے لئے آتے ہیں، ؤں کے ساتھ جان نہیں مارتے۔

" یہ تو بدبختی ہے ایسی اولاد کی جو ماں کو بڑھاپے میں نہ سنبھال سکے!" میں کہے بغیر نہ رہ سکی مثال سامنے ہی تو ہے، کرنل کی بیوہ....برین اسٹروک کی وجہ سے قابل رحم حالت میں امی کے سامنے والے بیڈ پر!!

نہ بول سکتی، نہ ہل سکتی، بس سانس لے رہی!! اس کی تیمارداری کے لئے خادمہ رکھی ہوئی ہے گھر والوں نے اور وہ خادمہ! کس قدر غیر انسانی سلوک کر رہی کرنل کی بیوہ کے ساتھ، تنخواہ بھی لیتی ہے، برا بھلا بھی کہتی ہے، سخت ہاتھ بھی لگاتی ہے، ہاتھ بھی جُڑ دیتی ہے، جانے کس شان اور آسائشوں سے بھر پور زندگی گزاری ہوگی نا اس نے اور اک خادمہ کے ہاتھوں اسکا یہ حال!!

میں بری طرح تڑپ جاتی ہوں اس کے سلوک پر......

"کتنی تنخواہ لیتی ہو؟" میں نے پوچھا!

"اٹھارہ ہزار، اور دیکھیں میڈم کتنا کام لیتے ہیں مجھ سے، اس معذور عورت کو میں اکیلی کیسے سنبھالوں؟؟" گویا وہ احسان کر رہی تھی

میں نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھو جس کام پر تم مامور ہو اچھے طریقے سے کرو، محبت تو تم شامل کر نہیں سکتی، اگر اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس عورت کے لئے ہمدردی کا جذبہ ساتھ شامل کر لو اور کچھ اخلاص بھی تو یہی ڈیوٹی تمہاری عبادت میں بدل جائے گی، اللہ تمہیں اجر عطا فرمائے گا، اور اگر رویہ یہی رکھو گی بی بی، تو پھر جان لو کہ یہ تو مکافات عمل ہے، پلٹ کے سب سامنے آنا ہی ہے، یہیں، اسی دُنیا میں! لیکن شائد اس خادمہ کا دل گوشت کا نہیں فولاد کا تھا......ورگھر والے بھی شائد مطمئن تھے

اِک منظر میری آنکھوں کے سامنے دھندلا سا گیا.. میری ساسو ماں کی نحیف آواز..."ناز یہاں میرے پاس آؤ، تم اتنی چپ چپ کیوں ہو"؟؟ میری آنکھیں بھیگنے لگیں، گلا رندھ گیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا یعنی کچھ نہیں امی جی! انہیں کیا پتہ کہ انکی اذیت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی... "اللہ کی قسم ناز تم مجھے ان سب سے زیادہ پیاری ہو" میری نند، دیور اور

میرے ہی کی طرف اشارہ کر کے میری ساسوماں کا یہ کہنا تھا کہ میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے، ان کے گلے لگ کے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی... ''ناز میرے دل سے اتنی زیادہ دعائیں نکلتی ہیں تمہارے لئے کہ اللہ اگر میری ان دعاؤں کو قبول کر لے تو تم جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ"....وہ بستر سے لگ چکی تھیں Hip bone فریکچر ہونے کی وجہ سے سرجری ہوئی راڈ ڈالا گیا، دل روتا تھا انکی یہ حالت دیکھ کر، میں تو اپنی ساسوماں کی خدمت سے کبھی اک پل بھی غافل نہ ہوئی....ان کے پیمپر بدلنا۔۔۔ان کو بچے کی طرح ہاتھوں میں اٹھا کر واش بیسن تک لے جانا، وہاں انکا منہ دُھلانا، برش کروانا، ان کے بال سنوارنا.... واپس گود میں اٹھا کر بستر تک لے لانا، انہیں بانہوں میں اٹھا کر باتھ روم لے جانا انہیں چیئر پر بٹھا کر نہلانا دھلانا کپڑے پہنانا، اور واپس بستر پر لٹانا میرا معمول تھا، اور یہ سب میں بہت محبت سے کرتی تھی۔۔۔۔۔۔خادمہ کی مدد بالکل نہیں لیتی تھی

''ناز میرے بیٹے اتنا سوچا نہ کرو''.....امی کی آواز مجھے یادوں سے واپس کھینچ لائی

ماں کے ہاتھوں کو تھامے کتنی ہی دیر آنکھوں میں آنسو لئے ان کے ہاتھ کی جھریاں دیکھتی رہتی تھی کہ یہ انگلیاں بھی تو میرے ہاتھ کی انگلیوں جیسی ہی تھیں.....ماں کے چہرے کی شکنوں پر پیار آنے لگتا اور میں ان شکنوں پر ہونٹ رکھتی چلی جاتی.....آنسو بہہ نکلتے

آج سرجری کی تیاری ہے، ضعیفی، کمزوری، اس پر ماں کی سرجری؟؟ پہلے جوانی میں بیوگی کا عذاب، پھر جوان بیٹے کو کفنانے کا دکھ!، پھولوں جیسے نواسے کو لحد میں اترتا دیکھنے کی اذیت!! اور آج تہتر سال کی عمر میں، اس ضعیفی اور پژمردگی کی حالت میں ماں سرجری کے عذاب سے بھی گزرے گی؟؟

اے کریم اللہ کرم کر دے، اے رحیم اللہ رحم کر دے، تجھے واسطہ ہے اس محبت کا جو تو اپنی مخلوق سے کرتا ہے، ستر ماؤں جتنے تیرے پیار کا واسطہ!!

زندگی رینگ رہی، بلک رہی، دل میں ہول اٹھ رہے!!

رات سے ماں کو کھانا پانی کچھ بھی تو نہیں دیا.....ان کی زبان خشک ہو رہی ہے، میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک قطرہ پانی کا ماں کے منہ میں ٹپکا دیتی ہوں کہ زبان تو نم رہے

وہ ماں جو ہم بہن بھائیوں کے ہاتھ پر لگی چھوٹی سی خراش سے رستے خون سے تڑپ جایا کرتی تھی آج آپریشن تھیٹر میں ہے، دل ہے کہ بہتا ہی چلا جا رہا.... یا اللہ، اے میرے رحیم اللہ، رحم کر دے! کاش کاش میرے بس میں ہو تو یہ ساری اذیت میں لے لوں! ایسا کیا کروں کہ اللہ جی کہ میری ماں کا درد دُور ہو جائے

ماں کی خالی آنکھیں خلاؤں میں کچھ تلاشتی ہیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور ماں کو اس عالم میں بھی بیٹیوں کا خیال! "ناز تم نے آنکھیں خراب کر لی ہیں اپنی رو رو کر، میرے بیٹے، اپنا خیال رکھو،" تو میں ماں کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ جاتی ہوں!! "دیکھو ناز! تمہاری باجی نے جوان بیٹا کھویا ہے، اسے بہت بڑا روگ لگا ہے، وہ بہت دکھی ہے" اور ماں بغیر آواز کے بلکتی جاتی، سسکتی جاتی اور پھر بیش قیمت دعاؤں کا سلسلہ ماں کی غنودگی تک جاری رہتا

اور درد کی شدت سے ماں جب منہ میں ہاتھوں کی انگلیاں دے کر چیخیں روکتی تو کلیجہ پھٹنے لگتا، بے ساختہ ماں کو خود میں سمیٹنے کی کوشش کرتی "'امی جی...میری امی...میری پیاری امی میں آپ کے قربان میری امی جی!" تو امی اس عالم میں بھی مجھے ایسا کہنے سے روک دیتیں، "نہیں ایسے نہیں کہتے...اللہ تمہیں تمہارے بچوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا رکھے"

بھائی کہتے ہیں کہ ''امی کی خدمت کرتے ہوئے، امی کی طرف نظر ڈالتے ہوئے حج کے ثواب کی تمنا رکھو دل میں''.....''پر مجھے ثواب یا اجر کا لالچ نہیں ہے بھائی! وہ تو مالک نے عطا کر ہی دینا ہے....

میرے دل سے تو محبت کا طوفان اٹھتا ہی چلا جا رہا ماں کے لئے" بھائی کے قائل کرنے کی کوشش پر بھی دل قائل نہ ہوا....''اللہ کی عبادت ثواب کے لالچ میں تو نہیں ہوتی نا بھائی، اللہ تو ہے ہی عبادت کے لائق اور ماں......ماں بھی تو رب ہی کا روپ ہے نا!! تو؟؟'' !! بھائی خموش ہو گئے

ماں سراپا دعا، تہجد گزار میری ماں، وہاں اس عالم میں بھی سورۃ مزمل حفظ کرتی رہیں درود شریف کا ورد انکی زبان پر جاری رہتا تھا، گھر واپس آنے کو بے چین تھیں کہ نمازیں قضا ہو رہی تھیں، جس شام ڈاکٹرز نے اجازت دے دی کہ امی کو غسل کرا دیں تا کہ لیٹ کر نماز پڑھ لیا کریں، اسی رات امی گھر آ گئیں

ایک ماہ امی کے ساتھ رہنے کے بعد واپس لاہور آ گئی ہوں کہ میرے بچوں کو بھی میری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مجھے میری ماں کی...کہ اپنے بچوں کے بنا میں بھی ادھوری

لیکن اداسی ہے کہ وجود سے بے طرح لپٹی چلی جا رہی، میرے ماتھے پر بھائی کا محبت بھرا بوسہ ثبت ہے، اور دل میرا امی کے پاس!! کہ

تیرا میرا ازل کا ہے رشتہ
تیرے دم سے ہے دم رواں میرا
تیری آغوش ہے پناہ مری
تیری ممتا ہے آسرا میرا
تُو سلامت تو میں سلامت ہوں
تیرے ہونے سے ہے مرا ہونا!

(ناز بٹ)

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ ''اے ارضِ لبنان''

حسن عباسی/لاہور

گزشتہ ماہ جو تازہ شائع ہونے والی کتابیں بذریعہ ڈاک مجھے موصول ہوئیں ان میں سب سے اہم اور دلچسپ کتاب ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ ''اے ارضِ لبنان'' ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک میرے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ اتنے پرانے کہ ان کے بارے کہا جاسکتا ہے پرانا دوست پرانی شراب ہوتا ہے۔ میں جب مادہ پرست دنیا میں رہتے ہوئے بہت مایوس ہو جاتا ہوں ڈاکٹر جعفر حسن کی باتیں زندگی پر میرا اعتبار بحال کرتی ہیں۔ وہ خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار بے لوث انسان ہیں۔ ان کی شخصیت کا صرف یہی پہلو علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے لیکن آج قارئین کے لیے ان کا مختصر تعارف اور سفرنامہ لبنان کے حوالے سے چند سطور لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک سے گزشتہ چند ماہ میں جب بھی بات ہوئی ان کے سفرنامہ لبنان کا ذکر ضرور آیا۔ انہوں نے لبنان کے حوالے سے اتنی معلوماتی اور دلچسپ باتیں بتائیں کہ مجھے اس سفرنامہ کی اشاعت کا انتظار ان سے بھی زیادہ رہنے لگا۔ اب جبکہ یہ سفرنامہ میرے ہاتھوں میں ہے تو میں روز و شب اس کی ورق گردانی میں مصروف ہوں۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے مختصر تعارف کی بات ہے ڈاکٹر جعفر حسن مبارک فیصل آباد میں مقیم ہیں۔ پی ایچ ڈی تک تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ EFU جنرل انشورنس کمپنی کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ نارکوٹکس کنٹرول سٹیڈنگ کمیٹی FCCI فیصل آباد کے چیئرمین ہیں۔ لٹریچر آرٹ اینڈ کلچر FCCI فیصل آباد کے چیئرمین ہیں۔ ڈسٹرکٹ کوآرڈنیشن کونسل او NGO'S سوشل ویلفیئر بیت المال حکومت پنجاب فیصل آباد کے وائس چیئرمین ہیں اسی طرح ڈرگ پروینشن پاک افغان زون، روٹری انٹرنیشنل 2010 کے چیئرمین ہیں۔ اسی طرح ڈرگ پروفیشن پاک افغان زون، روٹری انٹرنیشنل 2010 کے چیئرمین، روٹری انٹرنیشنل 3272 زون 2018ء کے اسسٹنٹ گورنر NGO's نیٹ ورک اور ANF پنجاب کے ریجنل پریذیڈنٹ پیشنٹ ویلفیئر سوسائٹی الائیڈ ہسپتال فیصل آباد کے صدر بھی ہیں۔

جہاں تک جعفر حسن مبارک کے تخلیقی اور ادبی سفر کا تعلق ہے ان میں ان کا تازہ سفرنامہ ''اے ارضِ لبنان'' کے علاوہ متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں نئے دنوں کے خواب (شاعری)، تنہا رہنا سیکھ لیا ہے (شاعری)، دریا سے صحرا تک (سفرنامہ دبئی)، کیسپر کے دیس میں (سفرنامہ آسٹریا)، اپنے استنبول میں (سفرنامہ ترکی)، ریزہ (افسانوی مجموعہ) اور میں نے نشہ چھوڑ دیا (علم المعتیات) شامل ہیں۔ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کو ان فلاحی اور ادبی کاوشوں کے سلسلے میں متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا جن میں ساغر صدیق ایوارڈ، فیض امن ایوارڈ سپارک انٹرنیشنل ایوارڈ کے علاوہ بہت سے اعزازات اور سرٹیفکیٹ شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا نام پرائیڈ آف پرفارمنس کے لیے بھی نامزد ہوا مگر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں پاکستان میں حقدار کو حق بمشکل یا دیر بعد ملتا ہے یا پھر اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ میں ڈاکٹر جعفر حسن کی تخلیقات کا مستقل قاری ہوں۔ خاص کر ان کے سفرنامے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو ان کی نثر بہت دلپذیر ہوتی ہے۔ دوسرا وہ سفر کے دوران برمحل اشعار کا استعمال بہت خوب صورت انداز میں کرتے ہیں۔ اے ارضِ لبنان کے حوالے سے سفرنامہ میں شامل ملک کے نامور ادیبوں محمود شام، محمد حمید شاہد اور ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ کی آرا اسے مزید معتبر بناتی ہیں۔ محمود شام ''اے ارضِ لبنان'' کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ صرف مشاہدہ ہی نہیں مطالعہ بھی ساتھ ساتھ رواں رہتا ہے۔ وہ بڑی مہارت سے جغرافیے، تاریخ، تہذیب، تمدن، اساطیر، ادب اور شاعری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہر مقام اور ہر واقعے کو صدیوں کے تناظر میں ہمیں دکھانے کی کوششیں کرتے ہیں۔''

اسی طرح محمد حمید شاہد نے ''سفر: سفر در سفر'' کے عنوان سے ''اے ارضِ لبنان'' کے بارے میں جو سطریں تحریر کی ہیں وہ قاری کے سفرنامہ پڑھنے کے اشتیاق کو بڑھا دیتی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''عجب سفر کہانی ہے کہ سفر در سفر ہو رہا ہے۔ خلیل جبران کے دیس میں جا کر ہمارے سفرنامہ نگار نے اس کے کہے کا پاس رکھا۔ محض وہی نہیں دیکھا جیسے روشنی ظاہر کرتی تھی اور وہی نہیں سنا جو کوئی آواز اعلان کرتی تھی۔ وہ ہر منظر اور ہر آواز سے آگے گیا وہ تاریخ میں اُترا۔ تہذیب کو کھنگالا۔ معیشت اور معاشرت کی ساری سطحوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور

ایسا لبنان دکھا دیا جو کئی بار اُجڑا اور ہر بار ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے جی اُٹھا۔

ڈاکٹر سہیل عباس بلوچ نے ایک قدم آگے کے عنوان سے سفرنامہ ''اے ارضِ لبنان'' کے فنی پہلوؤں اور ادبی خوبیوں کا جائزہ لیا ہے اور اس کی تعریف و توصیف میں دیگر ادیبوں سے ایک قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ چند سطور ملاحظہ کیجیے:

''جعفر حسن مبارک کا بطور سفرنامہ نگار اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے بخوبی جان لیا ہے کہ ادب عالیہ نے تخلیقی سفرنامے کے لیے جو معیارات طے کر رکھے ہیں انہیں کیسے دسترس میں لانا ہے۔ لہٰذا تخلیقی توانائیوں اور جمالیاتی حسیات کا بھرپور استعمال ان کے اظہار میں دل پذیری کا ایسا بانکپن سامنے لاتا ہے کہ جو حیران کن حد تک اپنے قاری کو متاثر کرنے پر قادر ہے۔''

ڈاکٹر جعفر حسن کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ ابتدا سے اختتام تک قاری کو اپنے حصار میں رکھتی ہے۔ مختلف موضوعات کے بیان کی وجہ سے قاری یکسانیت کا شکار نہیں ہوتا اور ادبی چاشنی لیے ہوئے اس سفرنامے کی دل پذیری میں کھویا رہتا ہے۔ بیروت کے ذکر میں سب سے اہم وہاں کی معروف گلوکارہ فیروز کا گیت ہے جو اُس نے آزادی تک لب بندی کے بعد گایا ڈاکٹر صاحب اس کے متعلق کچھ یوں لکھتے ہیں:

''فیروز کی پندرہ سالہ خود اختیار کردہ لب بندی کا حاصل یہ عربی نغمہ اگرچہ سننے سے تعلق رکھتا ہے مگر اس نغمے کی سماعت کے دوران میں اگر اس کے بولوں کی معنویت بھی آپ پر آشکار ہو رہی ہو تو شاید ہی کوئی سامع ایسا ہو کہ جو حسیاتی سطح پر اس نغمے سے متاثر نہ ہو سکے۔ وہ گیت کچھ یوں ہے:

بیروت کو......

بیروت کو میرا دلی سلام

چٹان ایسی...... ایک قدم جنگجو کی شباہت لیے اس شہر کو

اس سمندر اور در ہائے آبادگاں کو میرا پیار

وہ شہر کہ جس کی تعمیر اپنے شہریوں کو روح بقا یاب

گیہوں، شراب، پسینے اور گل یاسمن کے اجزاء سے ہوئی تھی

نہیں معلوم اس کی آب و ہوا میں

آگ اور دھوئیں کا ذائقہ کیسے در آیا ہے؟

یہ شہر اَب اپنی نسل نو کے خون سے آلودہ

اپنے ہاتھوں اپنے در بند کیے زمین و آسماں میں تنہا پڑا ہے

تاریک ترراتوں کی تنہائی کی طرح

میرے اس شہر کی قندیلیں گل ہیں

اے میرے شہر! تم میرے ہو...... تم میرے ہو

آؤ مجھے گلے ملو...... معانقہ کرو، تم میرے ہو

تمہی تو میرا پرچم ہو، میری لوح تقدیر ہو......

لہریں پھر سے محو سفر ہو گئی ہیں

میرے لوگوں کے زخم خوشبو دینے لگے ہیں

ماؤں کے آنسو پھول بنتے چلے جا رہے ہیں

تم میرے ہو بیروت...... تم میرے ہو

آؤ مجھ سے گلے ملو

ڈاکٹر جعفر حسن سراپا محبت ہے۔ ان کی دوستوں کے حوالے سے محبت بھی اس سفرنامے میں ہمیں جابجا ملتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے اشعار بغیر کسی شاعرانہ تعصب کے اپنے ہر سفرنامے میں شامل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان تمام دوستوں کا ذکر ہمیں سفرنامہ میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ جس کا کسی نہ کسی حوالے سے اس سفر کے دوران ان کی ذات یا سفر سے متعلق کوئی کنٹری بیوشن رہا ہو۔ لہٰذا ان کے سفرنامے کو صحت نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لبنان کی تاریخ تہذیب، معاشرت اور مقامات سیاحت کا ذکر اتنے بے تکلفانہ انداز میں کرتے ہیں جسے وہ فیصل آباد کی نہیں بلکہ لبنان کی گلیوں میں جوان ہوتے ہوں۔ تاہم اس میں صرف ڈاکٹر جعفر حسن کا کمال نہیں۔ بلکہ ان کی گائیڈ ماریہ کا بھی کمال ہے جس کا ذکر ڈاکٹر جعفر حسن خود سفرنامے کے اختتام پر کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ایئرپورٹ پر بسوں سے اُترتے ہوئے گائیڈ ماریہ نے ہم سب کا اپنی طرف سے لبنان وزٹ کرنے کا شکریہ ادا کیا اور اُمید ظاہر کی کہ ہم لوگ یہاں سے اچھی یادیں لے کر اپنے وطن واپس جا رہے ہوں گے۔ اس نے ہمارے لیے اچھے سفر کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے پھر دوبارہ لبنان آنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سب لوگ ایئرپورٹ کی طرف جا رہے تھے اور ماریہ انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر الوداعی طور پر ہاتھ ہلانے میں مصروف تھی۔ میں نے بھی اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔ الوداعی مصافحے کے دوران میں میں نے اُس سے کہا ''مجھے اعتراف کرنے دیجیے کہ آپ کی دی ہوئی لبنان کی بابت معلومات نے مجھے لبنان کو اس کے صحیح تاریخی، ثقافتی اور سماجی تناظر میں بہتر طور پر سمجھنے کی سہولت دی جس پر میں آپ کا ممنون ہوں دوسرا آپ کی بہترین مہمان نوازی کے لیے بھی آپ کا شکریہ واجب بنتا ہے۔ لبنان کی میری سیاحتی یادوں میں اُمید ہے کہ آپ کا سراپا بھی میری ان تابناک یادوں کا ہمیشہ ساتھ نبھاتا رہے گا۔

ماریہ نے کہا جعفر حسن آپ تو یہاں بھی شاعری کرنے لگے۔

امّی

عمار مسعود/ اسلام آباد

میری والدہ پروفیسر صدیقہ انور کا انتقال اس رمضان کے تیسرے روزے ہوا۔ عمر بیاسی برس تھی۔ انہوں نے تینوں روزے رکھے۔ انکی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سب نے ان سے ضد کی کہ آپ اس عمر میں روزہ نہ رکھیں۔ شرع بھی اجازت دیتی ہے۔ ضد سے تنگ آکر بالاخر انہوں نے تیسرے روزے کی افطار کے بعد وعدہ کیا کہ اب وہ اس رمضان میں مزید کوئی روزہ نہیں رکھیں گی۔ رات قریباً دس بجے انکی طبیعت خراب ہوئی اور گیارہ بجے تک وہ اس دنیا سے جا چکی تھیں۔ وہ آخری لمحے تک اپنی بات پر قائم رہیں۔ نہ انہوں نے اس رمضان کا کوئی روزہ قضا کیا اور نہ کسی سے کیا کوئی وعدہ توڑا۔

ان کا آخری دن انکی ساری زندگی کا خلاصہ ہے۔ صبح انہوں نے روزے کی حالت میں محلے کی خواتین کو قران پاک کا درس دیا۔ پھر ابو کے ساتھ مل کر ان تمام لوگوں کی فہرست مکمل کروائی کہ جن کو اس سال زکوت دینی تھی۔ ہر ایک کے نام کے ساتھ رقم لکھوائی۔ دوپہر کو اپنے کانپتے ہاتھوں سے افطار کے لیئے اپنی پسندیدہ ڈش پلاو بنایا۔ روزہ افطار کیا اور چپ چاپ اپنے آخری سفر پر چل دیں۔ انکی ساری زندگی اسی طرح گذری۔ یہی مصروفیات تمام عمر انکا معمول رہیں۔

وہ فارسی اور اردو ادب کی پروفیسر تھیں۔ تدریس سے انکو عشق تھا۔ ریٹائر ہوئیں تو کینسر کے موذی مرض نے آن لیا۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ امی کومے میں چلی گئیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ جانے کس معجزے کے سبب وہ اس بیماری سے صحت یاب ہو گئیں۔ اس بیماری کے بعد وہ تیس برس حیات رہیں۔ ان تیس برسوں میں انکا اوڑھنا بچھونا قران پاک کی تعلیم ہو گیا۔ محلے کی چند خواتین سے درس قران کا آغاز کیا اور پھر شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں ہوگئی۔ ہر درس کے بعد اپنی شاگردوں میں ٹافیاں تقسیم کرنا انکا محبوب مشغلہ تھا۔ ٹافیاں لانے کی ذمہ داری ہم سب کی تھی اس میں کوتاہی ناقابل برداشت تھی۔

قران کی تعلیم کی بعد انکی سب سے بڑی مصروفیت میرے والد انور مسعود تھے۔ ان کی شادی کو بچپن برس گذر گئے تھے۔ مگر انکی محبت اب تک مثالی تھی۔ میرے والد نے زندگی میں جو بھی شعر لکھا ہے سب پہلے میری والدہ کو سنایا۔ میری والدہ خود عالم فاضل تھیں وہ نئے لکھے اشعار میں تصحیح بھی کرتیں اور مشورہ بھی دیتیں۔ یہ دونوں اس طرح ایک دوسرے کی زندگی میں کچھ اسطرح مشغول تھے کہ یہ بھی ہوا کہ ابو نے اسلام آباد سے لاہور جانا ہے تو انکے گھر سے نکلتے ہی ہر پندرہ منٹ کے بعد دونوں ایک دوسرے کو فون کر کے اپنی اپنی خیریت کی اطلاع دیتے، ایک دوسرے کا حال پوچھتے۔ حد تو یہ تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کی اطلاع بھی بڑی باقاعدگی سے دیتے۔ میرے والد بڑے کامل یقین سے یہ بات کہتے ہیں کہ "انکی تمام تر کامیابیوں کا سہرا میری والدہ کی دعاوں کو جاتا ہے"۔ میرے والد پر اس بچپن برس کی رفاقت کے ختم ہونے کا بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ وہ اس غم کا اظہار تو نہیں کر رہے لیکن اب جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو ان پر گریہ طاری دیر تک طاری رہتا ہے۔ مغفرت کی دعا کے لیئے اٹھے ہاتھ بہت جلد آنسووں سے بھر جاتے ہیں۔۔

میری والدہ کا محبوب جملہ "شکر ہے، شکر ہے" تھا۔ وہ ہر حال میں شکر ادا کرنے کی وجہ تلاش کر لیتیں۔ حالات چاہے کتنے بھی خراب ہوں۔ مشکلات چاہے مالی ہو یا جسمانی، فکر کسی بچے کی ہو یا پھر کسی رشتہ دار کی پریشانی ہو وہ شکوہ نہیں کرتی تھیں۔ شکر ادا کرتی تھیں۔ جس بھر پور طریقے سے زندگی انہوں نے گذاری، جس محبت سے قران کے علم کو تقسیم کیا، جس محنت سے اولاد کی تربیت کی۔ اسکے بعد اب جب وہ اس جہان سے بغیر کسی کو تکلیف دیئے ہوئے، بغیر کسی کو امتحان میں ڈالے چلی گئیں تو مجھے واثق یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی جنت کے کسی باغ میں بیٹھی بڑی مطمئن مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ساری زندگی کے بارے میں کہہ رہی ہوں گی "شکر ہے شکر ہے"۔ شکر کی نعمت انہیں ہی میسر تھی۔ ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ انکے جانے کے بعد نہ ہمیں صبر آرہا ہے نہ ہی ہم سے "شکر ہے شکر ہے" کا ورد کیا جا رہا ہے۔

میری والدہ کی عمر کا ایک طویل عرصہ بہت عسرت میں بسر ہوا۔ اب آخری عمر میں کچھ مالی آسودگی نصیب ہوئی تو انکی فکریں اور بڑھ گئیں۔ وہ بہت مالدار خاتون نہیں تھیں مگر اسکے باوجود وہ سب کو بار بار تلقین کرتیں کہ میرا جو بھی تھوڑا بہت مال اسباب

ہے اسے شریعت کے عین مطابق تقسیم کیا جائے۔ وہ ہمیں ڈراتی بھی تھیں کہ جن کا اسباب شریعت کی رو کے مطابق تقسیم نہیں کیا جاتا انکی روحیں اذیت میں رہتی ہیں۔ تمام عمر بھٹکتی رہتی ہیں۔

ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے تئیں اس زعم میں مبتلا رہتا کہ وہ امی کا سب سے لاڈلا ہے۔ وہ سب سے ایک سا پیار کرتیں۔ سب کی کمزوریوں اور کجیوں پر پردہ ڈالتیں۔ سب میں خوبیاں تلاش کرتیں۔ بچوں کی معاملے میں انکی ایک عجیب عادت تھی۔ وہ بچوں کی کامیابیوں کی بہت زیادہ خوشیاں نہیں مناتی تھیں۔ وہ ان کامرانیوں کی تشہیر بھی نہیں کرتی تھیں۔ عجب بات یہ تھی کہ جب کوئی بچہ کوئی کامیابی حاصل کرتا، نئی گاڑی لیتا، نوکری میں پرموشن ملتی، کسی ایوارڈ کا مستحق قرار پاتا، یا کسی بچے کو کاروبار میں منافع ہوتا تو وہ بچہ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کا مستحق ہوتا۔ لیکن اگر کوئی بچہ زندگی کے کسی مرحلے میں ناکام ہوتا، کسی امتحان میں فیل ہو جاتا، کسی کو نقصان ہوتا تو وہ انکی محبت کا پہلے سے زیادہ مستحق بنتا۔ اسکے ساتھ انکا لاڈ بڑھ جاتا۔ اسکے لیئے دعاوں میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ ہماری کامیابیوں کی ہی نہیں بلکہ ناکامیوں کی بھی ساتھی تھیں۔

مہنگا لباس، زیورات، بڑی گاڑی یا کسی مہنگے ہوٹل میں کھانے سے انکو وحشت ہوتی تھی۔ وہ سادگی سے زندگی بسر کرنے کی قائل تھیں۔ یہی سادگی انکی زندگی کا شعار رہی اور یہی سادگی انہوں نے سفر آخرت کے وقت اختیار کی۔

اب مرحلہ ایسا جاں گسل ہے کہ کسی کو بھی ان کے جانے کا یقین نہیں آ رہا۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ اب انکی صحت کے لیئے دعا کرنی ہے یا انکی مغفرت کے لیئے ہاتھ اٹھانے ہیں۔ انکے لیئے دوائی لانی ہے یا پھر انکی قبر پر پھول بکھیرنے ہیں۔ انکی اچانک وفات پر آنسو بہانے ہیں یا پھر انکی زندگی پر رشک کرنا ہے۔

ہم پانچ بہن بھائیوں کی عمریں پینتالیس سے پچپن برس کے درمیان ہیں۔ یقین مانیئے اس رمضان کے تیسرے روزے سے پہلے تک ہم پانچوں بچے تھے۔ کم عمر تھے۔ ناسمجھ تھے۔ تیسرے روزے کے بعد سے ہم پانچوں اچانک بڑے ہو گئے ہیں۔ اچانک بے بس ہو گئے ہیں، اچانک بے چارے ہو گئے ہیں، اچانک بے سہارا ہو گئے ہیں۔

شاعرہ، کالم نویس اور مدیر ''ارژنگ''

لبنیٰ صفدر

کے شعری مجموعوں کے تازہ ایڈیشن

نہایت منفرد اور دیدہ زیب انداز میں

شائع ہو گئے ہیں

☆ محبت آئینہ کرلو......

☆ بارشوں کے موسم میں

☆ خوشبو ہے وہ صندل کی

☆ تمہیں تو میرا ہونا تھا

☆ یہ ہجر ہے یا وصال ہے؟

☆ تم محبت کا استعارہ ہو

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

ناشر: نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے

محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

شاعر اور سفرنامہ نگار

حسن عباسی

کی کتب

شعری مجموعے:

☆ جگنو میری سوچوں کے

☆ ہم نے بھی محبت کی ہے

☆ ایک محبت کافی ہے

☆ اک شام تمہارے جیسی ہو

☆ سائیں (حمدیہ مجموعہ)

☆ صاحب (حمدیہ مجموعہ)

☆ محبت سے کون ڈرتا ہے (طویل نظم)

سفرنامے:

☆ محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (بھارت)

☆ ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (یو اے ای)

☆ تتلیاں ستاتی ہیں (یورپ)

اپنی کتاب کی بہترین اشاعت کے لیے رابطہ کریں

ناشر: نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

افسانہ

اسپیشلسٹ

روبنسن گل/راولپنڈی

اَب تو میاں جی کے بدن میں بالکل جان نہ رہی تھی۔ بخار نے اُن کے تن بدن کو توڑ کر رکھ دیا تھا، اِس پر طرّہ یہ کہ جو کچھ کھاتے پیتے وہ اگلے ہی لمحے ''ریورس'' (Reverse) ہو جاتا۔ اِس طرح اُلٹیاں کر کر کے بھی میاں جی کا سارا نظام اُلٹا پلٹا ہو گیا تھا۔ ابتدائی طور پر تو اِس بخار کا علاج میاں جی نے خود ہی کرنے کی کوشش کی اور ہر چھ چھ گھنٹے بعد پیراسیٹامول کی دو گولیاں نگلنے لگے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

تشویش ناک صورتِ حال دیکھ کر بیگم نے دخل اندازی کی اور سب سے پہلے تو میاں جی کو دفتر سے چھٹیاں کروانا شروع کیں۔ اِس طرح اُن کا بھی بھلا ہو جاتا اور دو بخاروں کے درمیانی عرصے میں اُن سے لہسن، پیاز اور دیگر سبزیاں وغیرہ کٹوالیتیں کہ یوں بستر پر پڑے پڑے اُکتاہٹ نہ محسوس کرنے لگ جائیں۔ سبزیاں کاٹنے سے ایک تو دِل بہل جاتا دوسرا بیگم کا کہنا تھا کہ پیاز کاٹنے سے آنکھوں کی صفائی ہوتی ہے اور یہ بھی صحت کی بحالی کے لئے کارآمد ہے۔

میاں جی کا کھانس کھانس کر بُرا حال ہو جاتا اور پھر اُس کے بعد قے آ جاتی۔ اِن علامات سے بیگم نے اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو بخار کے پیچھے اِس منحوس کھانسی کا ہی ہاتھ ہے۔ متعدد بار میاں جی سے آں... آں... کروانے کے بعد آخر کار بیگم نے ''ڈکلیئر'' (declare) کر دیا کہ آپ کا تو گلا بُری طرح پکا ہوا ہے۔ کتنی بار منع کرتی ہوں کہ موسم بدل رہا ہو تو ٹھنڈا پانی پینا چھوڑ دیا کریں لیکن مجال ہے جو کبھی میری بات سُنی ہو بس ہمیشہ اپنی ہی من مانی کرتے ہیں آپ!''

چنانچہ بیگم کی تجاویز کی روشنی میں پیاز کاٹنے کے ساتھ ساتھ میاں جی نے ٹھنڈے پانی اور ٹھنڈی اشیاء سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ ویسے حقیقت تو یہ تھی کہ موسم بدلتے ہی پانی فریج میں رکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا تو میاں جی خصوصی طور پر ٹھنڈا پانی تو نہیں پی رہے تھے بلکہ اُتنے ہی درجہ حرارت والا پی رہے تھے جو باقی اہلِ خانہ تناول فرماتے تھے، مگر اُن سب کے گلے تو بالکل ٹھیک تھے۔

اَب تک میاں جی کی طبیعت سنبھل نہ رہی تھی۔ دفتر سے آج چھٹی کا چوتھا روز تھا کہ یوں اپنے شوہر کو بُری طرح کھانستا ہوا دیکھ کر بیگم کا دِل دہل گیا۔ اُنہوں نے میاں جی کا ''پروپر'' (Proper) علاج کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ امورِ خانہ داری کو پسِ پشت ڈال کر اُنہوں نے فون پر گھنٹہ بھر اپنی والدہ سے مفید مشورے لینا شروع کئے۔ بچے تو سکول گئے ہوئے تھے اور اُدھر میاں جی چائے اور پاپوں کا انتظار کر رہے تھے کیوں کہ بہت ہی زیادہ کمزوری ہو چکی تھی۔ مگر بیگم فون سے فارغ ہوتیں تو میاں جی کے ناشتے کا بندوبست کرتیں؟

والدہ محترمہ کے مشورے بھی بے شمار اور بیش بہا تھے، اُنہیں یہ فخر حاصل تھا کہ اُن کے یہ انمول ٹوٹکے صرف اُن ہی کے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلے آ رہے تھے۔ زبیدہ آپا کے ٹوٹکوں کو تو وہ گھاس بھی نہ ڈالتی تھیں کہ وہ سب نئی نسل کے چونچلے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتی تھیں کہ اُنہیں یہ نسخے اُن کی والدہ نے بتائے تھے اور یہ نسل در نسل آزمودہ ٹوٹکے ہیں۔ اُن کی والدہ کو اُن کی والدہ نے اور پھر اُن کی والدہ کو اُن کی والدہ یعنی میاں جی کی پڑدادی ساس نے بتائے تھے۔ چنانچہ یہ ٹوٹکے والدہ در والدہ منتقل ہوتے ہوئے اَب چوتھی یا پانچویں پشت تک پہنچ چکے تھے۔ برطانیہ کے آئین کی طرح یہ کسی بھی جگہ تحریری صورت میں محفوظ نہ تھے، بس سب کچھ زبانی کلامی تھا۔

''ہائے بیٹی، اپنے شوہر کو اِن نامُراد ڈاکٹروں کے ہتھے نہ چڑھا دینا، بندے کو دوائیاں دے دے مار دیتے ہیں اور مریض کا مُنہ بھی سارا وقت ''کوڑا'' (کڑوا) رہتا ہے۔''

''جی امی جان مَیں تو ابھی تک جوشاندہ دودھ انڈا، کچا پکا انڈا اور لیٹی (خشخاس سے تیار کردہ لیوی کی مانند کھیر) بنا کر کھلا رہی ہوں مگر کوئی افاقہ ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ آج چوتھا دن ہے اَب تو چھینکیں مار مار بھی بُرا حال ہے اور لگ رہا ہے کہ اِن ہی کی بے احتیاطی سے کہیں ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ اَب بچوں کے ساتھ تو انسان زبردستی کر لیتا ہے مگر اِس طرح سیانے بیانے بندے کے ساتھ انسان کیا کرے۔ کہتی تو رہتی ہوں کہ موٹر سائیکل پر جیکٹ کے بغیر نہ نکلا کریں۔ اَب بھگت رہے ہیں۔''

ویسے سردی نے شدت پکڑی ہی تھی کہ میاں صاحب نے موٹر سائیکل کو خیر باد کہہ دیا اور لوکل وین میں سفر کرنے لگے تا کہ سردی سے محفوظ رہیں۔ ویسے ہلکی ہلکی سردی، نزلہ و کھانسی وغیرہ کا سلسلہ تو ہفتے بھر سے چل رہا تھا۔ مگر بخار اور قے نے طبیعت کو زیادہ ہی

ناساز کردیا۔

میاں جی کی ساس نے بناء سٹیتھوسکوپ، ایکسرے اور بلڈ ٹسٹ وغیرہ کے اپنی بیٹی کی تشخیص کردہ بیماری کو ہی ''ویری فائی'' (verify) کردیا۔ لہٰذا اَب تو دو گواہیاں مل چکی تھیں اور یقیناً یہ کھانسی کا بگڑ جانا، گلے کا پک جانا دوسرے لفظوں میں Throat Infection ہی تھا مگر ساس جی ''اینٹی بیاٹک'' کے سخت خلاف تھیں صرف اور صرف دیسی حکمت اور جڑی بوٹیوں سے علاج معالجے پر یقین رکھتی تھیں۔

ایک بار پھر ایک نحیف سی آواز سنائی دی۔

''بیگم مجھے بھوک لگی ہے، چائے اور رس ہی دے دو۔''

''اوہو دیتی ہوں آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ دیکھا نہیں آپ ہی کے لئے فکر مند ہوں اور امی سے کوئی دیسی نسخہ پوچھ رہی ہوں۔''

بیگم کی والدہ محترمہ نے ''پرسکرپشن'' (Prescription) لکھوا دی تھی۔ مریض کو سردی سے بچنے اور ٹھنڈا گرم پینے سے سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ دودھ انڈا، جوشاندہ، کچا انڈا اور ''لیٹی'' جاری رکھنے کا کہا گیا تھا کہ ان چیزوں کے استعمال سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن سچ تو یہ تھا کہ شاید کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچ رہا تھا۔

نزلہ زکام کے حوالے سے میاں جی کی ساس نے ذاتی تحقیق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ نزلہ زکام کے دوسرے تیسرے دن تک ''خشخاس کی لیٹی'' فائدہ مند ثابت نہیں ہوتی ویسے بھی اگر پہلے دوسرے دن نزلے زکام کو روک دیا جائے تو پھر وہ سر کو چڑھ جاتا ہے اور اِس طرح وقت سے پہلے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ (میاں جی کو ویسے یہ خطرہ بھی نہیں تھا کیوں کہ وہ پہلے سے ہی تقریباً گنجے تھے)۔ چنانچہ مریض کو تیسرے دن لیٹی کھلانی چاہیے جو تین چار روز میں نزلہ زکام کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ویسے دوسری جانب میڈیکل سائنسز نے بھی یہ حقیقت دریافت کی ہے کہ اگر موسمی نزلے زکام کے لئے کوئی دوائی بھی استعمال نہ کی جائے تو اِس کا وائرس ایک ہفتہ کارروائیاں ڈال کر آخر کار اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

میاں جی کی بیگم بے حد خوش تھیں اور فخر محسوس کر رہی تھیں کہ والدہ کا بہت سا طبی علم اُن تک بخیر و عافیت منتقل ہو چکا ہے اور وہ اُسے موثر انداز میں استعمال میں بھی لا رہی ہیں۔ مگر نہ جانے اِس بار کیوں وہ سب ٹوٹکے میاں جی پر اثر انداز نہیں ہو رہے تھے۔ خیر اِس کا ذمہ دار بھی میاں جی کو ہی ٹھہرا دیا گیا کہ وہ جو اِس قدر پیراسٹیامول اور پیناڈول پھانکتے رہتے ہیں تو یہ اُن ہی دوائیوں کا نتیجہ ہے کہ دیسی ٹوٹکے جسم پر اثر نہیں کرتے۔ خیر سینئر اور تجربہ کار معالج کے مشورے کے مطابق دوائی استعمال ہونے لگی تھی تو اِس کا اثر تو یقینی طور پر ہونا تھا۔ گزشتہ ٹوٹکوں کو جاری رکھنے کے علاوہ اَب ہر روز صبح نہار مُنہ گلے کے اندر پھول کی ہوئی پھٹکری لگانے کا کہا گیا۔ خاص ہدایت کی گئی تھی کہ خام پھٹکری کو پہلے توے پر سِکنا ہے اِس طرح اُس کی تاثیر بدل جائے گی۔ وہ گرم توے پر پگھلے گی پھر اُس کو ٹھنڈا کر کے پیس لینا پھر انگوٹھا گیلا کر کے اُس پر اچھی طرح اُس پھول کی ہوئی پھٹکری کا لیپ لگا کر گلے کے اندر لگا دینا، یہ سب کام انگوٹھے کی مدد سے ہونا تھا اور انگوٹھے کو پہلے اچھی طرح دھونا بھی ضروری قرار دیا گیا تھا۔ رات کے وقت دیسی انڈے کو تل کر اُس میں منکے (بڑے والے کشمش) ڈال کر کھلانے کا کہا گیا۔ اِس کے علاوہ ایک چمچ شہد میں ایک چٹکی پسی ہوئی کالی مرچ ڈال کر کھانسی کا دَورہ پڑنے پر کھلانے کو کہا گیا تھا۔

میاں جی بے چارے تو چائے اور پاپوں کے خواب آنکھوں میں سجائے، آنکھیں موندھے ایک بار پھر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ بیگم بھی پھٹکری والی ''ٹریٹ منٹ'' (Treatment) اِسی لمحے سے شروع کرنا چاہتی تھیں۔ لہٰذا کچن کی اُس الماری کی جانچ پڑتال کا سلسلہ شروع ہوا جہاں اِس قسم کی اشیاء اور مصالحہ جات وغیرہ ذخیرہ کئے جاتے تھے۔ پھٹکری کی ایک عدد ڈلی آخری چند لفافوں میں سے برآمد ہوئی جو کسی زمانے میں خرید کر رکھی گئی تھی لیکن کیوں کہ ایسی اشیاء پر ایکسپائری ڈیٹ (expiry date) نہیں ہوتی چنانچہ اِس کے ایکسپائر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اَب چیزیں تو تمام کی تمام الماری سے باہر آ ہی چکی تھیں۔ بیگم نے سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں الماری کی صفائی ہی کر دی جائے چنانچہ اگلے چند لمحوں میں الماری کے فرش پر اخبار بچھ چکے تھے اور پھر تمام لفافے ترتیب کے ساتھ الماری میں دوبارہ سے قرینے کے ساتھ سجا دیئے گئے۔

ہدایات کے مطابق پھٹکری کو توے پر گرم کیا گیا اور پھر پیس کر بڑی احتیاط سے کپڑ چھان کیا گیا، مشورے کے مطابق ہاتھ دھوئے گئے اور اَب مرحلہ تھا میاں جی کو جگانے اور اُن کے گلے میں پھٹکری لگانے کا۔ بے چارے کچی نیند ہی سو رہے تھے، بیگم کی ایک آواز پر اُٹھ بیٹھے۔ بیگم نے دہنے ہاتھ کے گیلے انگوٹھے پر پھٹکری کی تہہ چڑھا رکھی تھی اور پھر میاں جی کو ''آں'' کرنے کو کہا۔ وہ سمجھے کہ ایک بار پھر اُن کے گلے کا معائنہ ہونے لگا ہے مگر ابھی میاں جی مُنہ کھولے اور آنکھیں موندھے ہوئے ''آں'' ہی کر رہے تھے کہ بیگم نے پھٹکری والا پورے کا پورا انگوٹھا مُنہ میں ٹھونس دیا۔ بس پھر کیا تھا میاں جی کے چودہ طبق روشن ہو گئے، اُن کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور کھانسی کا

دورہ شروع ہوگیا۔ کھانس کھانس کر جب ریشہ برآمد ہوا تو بیگم بولیں،

''دیکھا کتنا زبردست ٹوٹکا ہے، فوراً ہی چھاتی صاف ہوگئی۔''

میاں جی کے اوسان بحال ہوئے تو انتہائی شریفانہ انداز میں بولے''بیگم چھاتی کیا آپ نے تو طبیعت بھی صاف کردی ہے۔''

آنسو اُن کے گرم گرم رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ بیگم نے ایک بار پھر کہا،''اَب آدھا گھنٹہ آرام کریں، پھر ناشتہ کرواتی ہوں۔''

''آرام ہی تو کر رہا تھا، آپ نے آکر جگا دیا۔'' میاں جی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

اَب میاں جی علاج کے تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے، یعنی پہلے خود سے اپنا علاج کرنے کی کوشش کر رہے تھے پھر بیگم نے اپنے ٹوٹکے استعمال کرنا شروع کئے اور اَب ساس جی کے نسخہ جات پر عمل درآمد شروع کردیا گیا تھا۔

تاہم اَب معدے نے بھی اعلانِ جنگ کردیا اور ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ یہ کچے پکے تلے ہوئے دیسی انڈے کے ساتھ مٹکے کھانے کا نتیجہ تھا اور پھر خشخاس کی لیٹی نے بھی کچھ اثر دکھایا تھا۔ چاروناچار میاں جی نے مقامی ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اپنے بیٹے کے ہمراہ ہانپتے کانپتے کلینک پہنچے تو وہاں پہلے ہی مریضوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میاں جی نے گرم شال لپیٹ رکھی تھی اور مُنہ سے ہائے ہائے کی آوازیں ایک تواتر کے ساتھ نکال رہے تھے اور اِس ہائے ہائے میں اِس قدر درد اور سوز چھپا ہوا تھا کہ اپنی باری کی ضد کرنے والے دیگر مریضوں نے ترس کھا کر اُنہیں پہلے چیک اَپ کا موقع دے دیا۔ تاہم اِس دوران اُنہیں اِردگرد بیٹھے احباب کو باری باری اپنی تکلیف کے بارے میں بتانا پڑا۔ حتیٰ کہ وہ کوفت محسوس کرنے لگے۔

''آخر ہوا کیا ہے جناب؟ مسئلہ کیا ہے؟''

میاں جی کُڑھتے ہوئے دِل میں کہنے لگے،

''بے عقلو! اگر پتہ ہوتا کہ مسئلہ کیا ہے تو پھر ڈاکٹر کے پاس کیوں آتا؟''

بیماری ہی کی تو تشخیص نہیں ہو پا رہی تھی اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ اَب تک بیگم صاحبہ علامات کا ہی علاج کرنے میں مصروف تھیں۔ صحیح طور سے ٹیسٹ وغیرہ تو ہوئے نہیں تھے اور نہ ہی کسی ڈاکٹر نے معائنہ کیا تھا۔ اَب چاروناچار معائنہ کروانے آگئے تھے۔ ایک دو لوگوں کو تو میاں جی نے اپنی ہائے ہائے کی وجوہات بتائیں مگر جب وہ اُکتا گئے تو اُن کے بیٹے نے وہی سب باتیں کسی ریکارڈر کی طرح دوہرانا شروع کردیں۔

کلینک میں بیٹھے تقریباً ہر شخص کے پاس کوئی نہ کوئی مشورہ تھا جو مفت میں پیش کیا جاتا تھا۔ یہاں ہمارے ہاں ایک شخص جس بیماری میں سے ایک بار گزر جاتا ہے، وہ اُس بیماری کے علاج کا اسپیشلسٹ بن جاتا ہے۔ چاہے دیسی ٹوٹکے ہوں یا بدیسی دوائیاں، ......بلا سوچے سمجھے ایک دوسرے کو تجویز کرنے سے باز نہیں آتے اور کئی احباب تو اِسی طرح دوائیاں کھاتے رہتے ہیں۔

میاں جی کو بھی ڈاکٹر کے پاس پہنچنے سے پہلے پہلے بہت سے مفید اور مفت مشورے مل چکے تھے۔ مگر وہ ایسے ہی مفت مشوروں سے پہلے استفادہ حاصل کر چکے تھے، تبھی تو اِس حال کو پہنچ چکے تھے۔

جب ڈاکٹر صاحب کو معائنہ کروانے لگے تو وہ پہلے ہی عجلت میں دکھائی دیتا تھا کیوں کہ بہت سے مریضوں کا حق ادا کرنا تھا اِس لئے ڈاکٹر کو سرعت اور تیز رفتاری سے ہر مریض کو دیکھنا تھا۔

''مُنہ کھولیے!'' ایک بار پھر میاں جی ''آں'' کر رہے تھے۔ مگر اِس بار انگوٹھے کی بجائے عوامی تھرما میٹر اُن کے مُنہ میں گھسا دیا گیا۔

''زبان کے نیچے رکھ لیں۔''

ڈاکٹر نے تھرما میٹر کے بعد دوبارہ ''آں'' کروایا اور اپنی تیز نظروں سے تیزی کے ساتھ میاں جی کے گلے کا معائنہ کرنے کے بعد کاغذ پر دوائیاں لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

میاں جی نے پُرتجسس انداز میں پوچھا،

''ڈاکٹر صاحب مسئلہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں بس وائرل انفیکشن ہے، پانچ دن کا کورس کریں گے تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

میاں جی پریشانی کے عالم میں بولے،

''مگر ڈاکٹر صاحب میرا پیٹ تو پہلے ہی خراب ہے۔''

''چلیں کوئی بات نہیں مَیں معدے کی دوائی بھی لکھ دیتا ہوں... یہ دوائیاں فارمیسی سے خرید لیں اور نسخے کے مطابق استعمال کریں۔ انشاللہ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

میاں جی کے بیٹے نے دانائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ ہی لیا،

''ڈاکٹر صاحب کوئی ٹیسٹ کروانے کی ضرورت تو نہیں، کیا پتہ کوئی اور مسئلہ ہو؟''

''ڈاکٹر قدرے برہمی سے کہنے لگا،

''ڈاکٹر مَیں ہوں یا آپ، ہم نے سینکڑوں مریضوں کو روزانہ دیکھنا ہوتا ہے، فکر نہ کریں آج کل یہی بیماری زیادہ تر چل رہی ہے ہر دوسرے مریض کو یہی مسئلہ ہوتا ہے۔

میاں جی کہنا چاہ رہے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ مَیں وہ دوسرا مریض نہ ہوں۔ مگر ڈاکٹر نے فوراً گھنٹی بجائی

اور اگلے مریض کو بھیجنے کا کہا۔ دونوں باپ بیٹا نے دوائیاں خریدیں اور گھر کو آ گئے۔

پہلی خوراک کا تو واقعی جادوئی اثر ہوا اور میاں جی بہتر محسوس کرنے لگے، مگر اگلی شام تک تو اُن کا حشر نشر ہوگیا۔ اِس دوران میں اُن کے محلے داروں، رشتے داروں اور دفتر کے دوستوں نے بھی اُن کی عیادت کے لئے آنا شروع کر دیا۔ ہر شخص اپنے ساتھ مفت مشورے لاتا، کوئی کچھ کھانے کو کہہ جاتا تو کوئی کچھ کھانے سے پرہیز کا کہہ دیتا۔ کوئی دیسی ٹوٹکوں کی تعریف کرتا، کوئی اُن کو جہالت اور پرانے وقتوں سے منسوب کرتا، کوئی مقامی ڈاکٹروں کی نااہلی اور جعلی ڈگری پر بڑے وثوق کے ساتھ سیر حاصل بحث کرتا۔ کوئی نمک اور ڈسپرین کو گرم پانی میں ڈال کر غرارے کرنے کا مشورہ دیتا۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔

آخر تھک ہار کر میاں جی کو بڑے ہسپتال جانا پڑ گیا جہاں ڈاکٹر کی فیس ہی خاصی بھاری بھرکم تھی۔ ڈاکٹر نے جیب تو کھلوا ہی لی تھی اب مُنہ کھولنے کا کہا پھر آنکھیں کھول کر معائنہ کیا اور بولا،

''اِن کے بعد میں پانی کی شدید کمی دکھائی دے رہی ہے، ڈرپ لگوانا پڑے گی۔ ابھی فی الحال چند گھنٹوں کے لئے آپ کو ہسپتال کی جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیتے ہیں۔ آپ کو تین گھنٹے کے لئے داخل ہونا پڑے گا۔

''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق میاں جی کو ہر بات پر اتفاق کرنا پڑا کیوں کہ اُن کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُنہیں تو ڈرپ لگا دی گئی جبکہ اُن کا بیٹا لیب میں ٹسٹ وغیرہ کروانے میں مصروف ہوگیا۔ پہلا خدشہ یرقان کا تھا اِس لئے اُن کے بلڈ کے ذریعے سے اُن کے مختلف ٹیسٹ ہوئے۔ گھنٹے ڈیڑھ کے بعد رپورٹ آئی تو اُس میں یرقان کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بیٹے نے تو خوشی سے آ کر بتایا،

''ابو جی، ابو جی... آپ کو یرقان نہیں ہے۔''

مگر میاں جی کے لئے فکر مندی کی بات تھی کہ اگر یرقان بھی نہیں ہے تو پھر آخر مسئلہ کیا ہے؟ یہ ہی تو بڑا مسئلہ تھا کہ اَب تک کوئی مسئلہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔

خیر ڈاکٹر کو تمام رپورٹس دکھائی گئیں، بلڈ رپورٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وائٹ بلڈ سیلز اور پلیٹلیٹس کم تھے۔ یعنی بدن میں انفکشن تھا اور اِس کے علاوہ ٹائیفائیڈ اور ڈینگی کا بھی خدشہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر نے فوری طور پر یہ دو ٹیسٹ بھی تجویز کر دیے۔

ڈرپ لگ جانے کے بعد میاں جی قدرے بہتر محسوس کر رہے تھے، طبیعت بحال ہونا شروع ہوئی۔ وہ اور اُن کا بیٹا جنرل وارڈ میں اَب رات گزارنے پر غور و خوض کر رہے تھے۔ ساتھ والے بستر پر کسی بزرگ کا آپریشن ہوا تھا اور وہ بڑا ہی ہشاش بشاش تھا۔ جب اُسے میاں جی نے آگاہ کیا کہ یرقان کا خدشہ ہے تو ایک بار پھر سے مفت مشوروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

''بیٹا شربت بزوری ٹھنڈی تاثیر رکھتا ہے۔ اُسے زیادہ سے زیادہ استعمال کرو۔ اِس کے علاوہ گنے کا رس بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔'' اور مشورے سنتے سنتے میاں جی کی آنکھ لگ گئی۔

ڈاکٹر ٹائیفائیڈ اور ڈینگی کے ٹیسٹ لکھ کر چھٹی کر گیا۔ چنانچہ میاں جی کو تین گھنٹے ہسپتال میں رہنے کی بجائے اَب رات بھر یہیں رہنا تھا کیوں کہ اصل مسئلے کا علم نہ ہو سکا تھا لہٰذا اُن کا بلڈ سیمپل ایک بار پھر لیبارٹری میں بھیج دیا گیا۔

باپ اور بیٹے دونوں کو رپورٹس کا شدت سے انتظار تھا تاکہ پتہ چل سکے کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ وقفے وقفے سے بیٹا اُٹھ کر وارڈ کے نرس انچارج کے پاس جاتا اور پوچھتا کہ ابو کی رپورٹ آئی یا نہیں۔ آخر اُس میل نرس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولتے ہوئے قدرے برہمی سے میاں جی کے بیٹے سے کہا،

''اَب آرام سے سو جاؤ، ڈاکٹر نے صبح آنا ہے، رپورٹ آ بھی گئی تو تم لوگوں نے کیا کر لینا ہے۔ اِس لئے چپ کر کے سو جاؤ۔ آ جائے گی تھوڑی دیر تک تو بتا دوں گا۔''

مگر حقیقت میں وہ رپورٹ منگوانے کے لئے سنجیدہ نہ تھا۔ تاہم بچے کے بار بار پوچھنے پر اُس نے وارڈ بوائے کو بھیج ہی دیا۔

اَب رات کے ساڑھے بارہ ہو چکے تھے۔ جب وارڈ میں ہر طرف سناٹا چھا گیا اور ہشاش بشاش بابا جی بھی خراٹے لینے لگے تو وارڈ بوائے رپورٹس لے آیا۔ جونہی کاؤنٹر پر رکھیں تو نرس کی آنکھ کھل گئی، اُس نے رپورٹس پر نگاہ ڈالے بنا وارڈ بوائے سے کہا،

''جاؤ ذرا اِس لڑکے کو جگا کر یہ رپورٹ دو، بڑی جلدی تھی رپورٹ کی اَب دونوں گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔''

وارڈ بوائے بھی بدتمیز قسم کا انسان تھا کرسی پر آنکھیں موندھے نیند کی آغوش میں گئے اُس لڑکے کے کندھوں کو اُس نے زور زور سے جھنجھوڑا اور ساتھ ساتھ بلند آواز سے چلایا،

''اوئے اوئے اُٹھو، اُٹھو رپورٹ آ گئی ہے، بچہ تو بعد میں اُٹھا مگر ساتھ والے بابا جی اور میاں جی پہلے جاگ اُٹھے۔ میاں جی کے لڑکے نے رپورٹس نکال کر سرسری نظر ڈالی۔ ٹائیفائیڈ نہیں تھا البتہ خون کے ٹیسٹ کے ذریعے ڈینگی کی تصدیق ہوگئی تھی۔

بجھے ہوئے انداز میں بولا،

''ابو کو تو ڈینگی ہوگیا ہے۔''

میاں جی سے زیادہ ساتھ والے بابا جی گھبرا

گئے اور لگے مفید مشورے دیئے،

"بیٹا گھبرانا نہیں... بس سیبوں کے تازہ جوس میں لیموں کا رس ڈال کر پیتے جاؤ۔ سُنا ہے ڈینگی میں یہ ٹوٹکا انتہائی مفید ہے۔"

میاں جی کا بیٹا بوجھل قدموں سے نرسنگ کاؤنٹر تک گیا اور مریل سی آواز میں رونے والی شکل بنا کر بولا، "ابو کو ڈینگی ہو گیا ہے۔"

یہ سُنا تھا کہ نرس تو ایسے حرکت میں آیا گویا اُسے الیکٹرک چیئر پر بیٹھا دیا گیا ہو۔ وہ یک دم سے ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا اور چلانے لگا،

"او ہو 'ڈنگی' والے مریضوں کو تو الگ کمرے میں رکھا جاتا ہے آپ اِدھر کہاں آ گئے ہیں؟"

ساتھ ہی وارڈ بوائے کو غصّے سے آواز دی،

"اوئے الّو تجھے نہیں پتہ ڈنگی کے مریضوں کو ڈنگی رُوم میں رکھتے ہیں۔ یہ مریض تو سب کے لئے خطرناک ہے۔" (نرس ڈینگی کو ڈنگی ہی بولتا تھا)

پھر اُس نے فون گھمایا اور ہانپتے ہوئے بولا،

"ڈنگی روم تیار کرو، جلدی سے ڈنگی رُوم تیار کرو... ڈنگی کا مریض بھجوا رہا ہوں۔"

اور پھر میاں جی کے ساتھ یوں برتاؤ کرنے لگا کہ گویا اُنہیں کوڑھ یا ایڈز ہو گیا ہو۔

"چلیں جی چلیں، جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹیں، آپ کو ڈنگی وارڈ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ کیا آپ کو نہیں پتہ کہ ڈنگی والا مریض دوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔"

میاں جی گھبرا کر بولے،

"اچھا کیا یہ سانس سے پھیلنے والی بیماری ہے۔"

"اوہ نہیں یارا، سانس سے نہیں پھیلتی لیکن اگر کسی مچھر نے اَب آپ کو کاٹ لیا تو وہ بھی ڈنگی والا ہو جائے گا۔ اِس لئے آپ کو آئسولیشن میں رکھیں گے۔"

آئس کا لفظ سُن کر میاں جی کا بیٹا گھبرا گیا،

"مگر ابو جی کو تو پہلے ہی بڑی سردی لگ رہی ہے، آئس والے کمرے میں تو بیمار ہو جائیں گے۔"

"خُدا کے بندو، جاؤ یہاں سے اور خود جا کر دیکھ لو ڈنگی وارڈ میں کیا ہے۔ اوئے شبیر ویل چئیر لا اور اِن کو لے جا!"

میاں جی کو ہسپتال والوں نے تین گھنٹے کا کہہ کر رات بھر کے لئے اپنا مہمان بنا لیا تھا اور اَب جنرل وارڈ سے پرائیوٹ روم میں لا چکے تھے۔ یہاں بیڈ کے علاوہ ایک عدد صوفہ، دو کرسیاں، ٹی وی اور اے سی اِنورٹر بھی تھا جو گرم ہوا دے رہا تھا۔ پرائیویٹ روم کو ڈینگی میں اِس طرح تبدیل کیا گیا کہ بیڈ کے چاروں کونوں میں ڈنڈے لگا کر اُس پر جالی ڈال دی گئی۔ مچھر دانی کا انداز ایسا تھا کہ گاؤں کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میاں جی کو اَب جالی کے اندر گھسا کر چاروں جانب سے بند کر دیا گیا کہ کہیں سے مچھروں کی رسائی ممکن نہ ہو سکے مگر جالی دو جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی اور سوراخ اتنے بڑے تھے کہ مچھر تو کیا، مچھروں کا پورا جلوس ایک وقت میں داخل ہو سکتا تھا۔

اسپتال کا ایک عدد ملازم بڑی سی توند نکالے، نیند کی حالت میں بلا سوچے سمجھے مچھر مار سپرے کر کے گیا کہ چند لمحوں کے لئے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا، یہ تو ڈینگی رُوم تھا ناں۔

اِس پرائیویٹ وارڈ کا ایک رات کا کرایہ بھی کسی فور سٹار ہوٹل کی مانند ہی تھا۔ اگلے روز عزیزوں کا تانتا بندھا رہا اور میاں جی جالی میں سے ہی سب کا دیدار کرتے رہے۔ جتنے مہمان اُتنے مشورے بلکہ اوسطاً ہر مہمان نے تین مشورے دیے۔

"میاں جی پپیتا زیادہ سے زیادہ کھائیں۔"

"اناروں کا جوس ڈینگی میں بہت مفید ہوتا ہے۔"

"پپیتے کے پتوں کا قہوہ بنا کر پئیں، دوسرا بولا، قہوہ نہیں جوس..."

میاں جی تمام مشورے نوٹ کرتے رہے۔

"میاں جی سب باتیں چھوڑیں، بس سیبوں کا جوس لیموں ڈال کر پیتے رہیں ڈینگی دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

اگلے روز میاں جی بہتر محسوس کر رہے تھے، بخار میں بھی کمی واقع ہو گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میاں جی کو گھر واپس لوٹنا تھا کیوں کہ ہسپتال کا بل کسی خلائی راکٹ کی طرح تیزی سے بلند ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اَب طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

میاں جی نے گھر لوٹ کر ایک ہفتہ آرام کیا۔ بہت سے عزیز رشتے دار اپنے مفید مشوروں کے ساتھ عیادت کرنے کے لئے آتے رہے۔ میاں جی کو ایک بات کا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمارے ہاں ہر بیماری کے اسپشلسٹ گلی گلی پھرتے ہیں اور بنا فیس کے مشورے دیتے ہیں۔

اَب میاں جی بالکل تندرست و توانا تھے...اور پھر ایک روز وہ اپنے ایک عزیز کی عیادت کرنے جا رہے تھے۔ سُنید تھی کہ اُسے یرقان کی شکایت ہے اُن کے پاس بیٹھے، حال احوال پوچھا اور پھر ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالتے ہوئے بولے،

"یار شربت بزوری ٹھنڈی تاثیر رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ گنے کا رس بھی مفید ہے۔ دونوں زیادہ سے زیادہ استعمال کرو، انشاءاللہ افاقہ ہوگا۔"

میاں جی اگرچہ ڈینگی کے ایکسپرٹ ہو چکے تھے مگر یرقان، بخار، کھانسی، نزلہ و زکام جیسی بیماریوں کے ٹوٹکوں سے بھی خاصی واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ کسی مریض کے پاس خاموش نہ بیٹھتے، یعنی ملک میں ایک اور اسپیشلسٹ کا اضافہ ہو چکا تھا۔

ایسٹی لاڈر

شائستہ مفتی/کراچی

بازار سے گزرتے ہوئے جوں ہی شبنم کی نظریں ایسٹی لاڈر کی میک اپ کٹ پر پڑی تو مانو قدم جیسے زمین میں دھنس گئے۔ دیر تک آنکھیں اسی میک اپ کٹ پر جمی رہیں۔ سرخ، گلابی، کاسنی، نارنجی، سنہری اور روپہلی رنگوں کی یادوں کی دھول ہر طرف اڑنے لگی۔ آس پاس کے ماحول سے بے خبر شبنم کے چہرے پر بھولی ہوئی یادوں کا آسیب ہنسی اُڑانے لگا۔ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے شوہر نامدار کو جب احساس ہوا کہ شبنم بہت پیچھے رہ گئی ہے تو وہ بیچ بازار میں ہی زور سے دھاڑے "کیا کر رہی ہو وہاں؟"

مہکتے گلابوں کے جنگل سے نکلنے کے لیے صرف ایک لمحہ ہی تو درکار ہوتا ہے۔ حقیقت پھر اپنا بدصورت چہرہ لیے سامنے کھڑی تھی۔ شبنم نے گہری سانس لی۔ دکھ کی رینگتی دیمک جیسے پورے وجود کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ ابھی وہ آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ شبنم کو محسوس ہوا کہ سیاہ اور سفید رنگ کا وہ لمحہ جو ایک عرصے سے اس کی زندگی میں ٹھہر گیا تھا، اچانک ہی گزر گیا۔

ایسٹی لاڈر......! ادھورے خوابوں کی ایک انمٹ داستان۔ برانڈز کے زمانے میں شبنم نے کبھی کسی برانڈ کی خواہش نہیں کی۔ مگر ایسٹی لاڈر کا نام جہاں کہیں بھی آتا تو یوں محسوس ہوتا کہ اردگرد کے ماحول میں رنگوں کی پھوار سی ہونے لگی ہو۔

"کیا صرف ایک میک اپ کٹ کے سہارے زندگی گزاری جاسکتی ہے؟" شبنم یہ سوال اپنے آپ سے بارہا کرتی اور پھر سر جھکا کر اپنے کاموں میں لگ جاتی۔

یہ سوال تو خود ایک جواب تھا۔ وہ یقیناً ایک کٹ کے سہارے ہی زندگی گزار رہی تھی۔

غریب گھرانے میں آنکھیں کھولنے والی لڑکی کے خواب ہی کیا ہوتے ہیں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی ایک جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ جوانی بھی آئی تو ڈری سہمی سی۔

سیاہ اور سفید رنگ کی دنیا میں رہتے ہوئے شبنم کو احساس ہی نہ ہوا کہ باہر کی دنیا میں کتنے رنگ ہیں۔ سخت گرمیوں کے موسم میں گلی کے نکڑ پر لگے املتاس میں جب پیلے پیلے پھول آتے تو شبنم حیرت سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ان پھولوں کو دیکھتی۔ دو آنکھوں سے جتنا دیکھا جا سکتا تھا شبنم ان پھولوں کو دیکھتی اور پھر پورے سال اب رنگوں میں کھوئی رہتی۔ رنگ جو شبنم کی زندگی میں ناپید تھے۔ رنگ جن کی خواہش بھی شاید تہمت لگتی تھی۔

پھر نہ جانے کب اور کہاں شبنم کو ایک امیرزادے نے دیکھا اور شبنم کی سادگی پر اپنا دل ہار بیٹھا۔ شبنم اس غیر متوقع التفات پر بوکھلا کر رہ گئی۔ شہد کا ذائقہ نہ چکھنے والے کو شہد بھی زہر ہی لگتا ہے۔ گھٹی ہوئی فضا میں رہنے والوں کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا بھی سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے رنگوں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر رکھنے والے کو آخر کار شبنم کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑ گئے۔ پورا محلّہ ہی تو اکٹھا ہو گیا تھا جب شبنم کے دروازے کے آگے کالے رنگ کی چمچماتی کار آ کر رکی اور اس میں سے ایک الٹرا ماڈرن قسم کی خاتون ناک پر رومال رکھ کر اُتریں اور اترتے ہی اپنے بیٹے کو بری طرح جھاڑ پلانے لگیں۔

مگر کیا کرتیں، ایک ہی بیٹا تھا۔ اُس کے ارمانوں کا خیال رکھنا بھی پروری تھا۔ چاند کی خواہش کرنے والے نے زمین پر رہنے والی ایک حوا کی بیٹی کا انتخاب کرلیا تھا۔

بہت سارے تحفے تحائف لے کر جب وہ شبنم کے گھر پہنچیں تو یوں لگا جیسے کسی گندے جوہڑ میں چودھویں کا چاند اُتر آیا ہو۔ رشتے ناطے کی بات کیا کرنی تھی ایک نظر شبنم کو دیکھا اور شبنم کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہنا کر چلی گئیں۔

ہر کوئی شبنم کے نصیب پر رشک کر رہا تھا۔ منگنی پر آنے والے جوڑے، زیور اور میک اپ کا سامان شبنم کے اردگرد بکھرا تھا۔ شبنم حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا کہ شاید یہ سب کچھ ایسٹی لاڈر پر پڑی...... کسی غیر مرئی قوت کے تحت شبنم نے میک اپ کٹ اُٹھائی۔ دھیرے سے کھولا تو اچانک ہی سرخ، گلابی، کاسنی، نارنجی، سنہری اور روپہلی رنگوں کی ایک بوچھاڑ تھی جو شبنم پر برس گئی اور شبنم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شبنم پر ایسا روپ چڑھا کہ دیکھنے والوں نے اُنگلیاں منہ میں دبا لیں۔ گندمی رنگت کی عام سے نقش ونگار والی لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے شہزادی لگنے لگی۔ یوں لگتا کہ جیسے ہر لمحہ رنگوں کی پھوار سے شبنم کے رنگ قوسِ قزح ہو گئے ہوں۔ وہ دن بھی دور نہیں تھے جب شبنم ایسٹی لاڈر کی کٹ کو اپنی سنگھار میز پر سجانے والی تھی۔ وہ دن آنے ہی والے تھے جب ہر طرف رنگوں کی کہکشائیں رقص کرنے والی تھیں۔

اور پھر جانے کس کی نظر لگ گئی۔ شاید یہ

خوبصورت خواب شبنم کی معصوم آنکھوں سے زیادہ بڑے تھے۔ سما ہی نہ سکے...... اور چھن سے ٹوٹ گئے۔ شبنم اپنی خالی ہتھیلیوں کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ ایک تتلی جو ابھی ابھی اس کے ہاتھوں پر آ کر بیٹھی تھی۔ وہ تتلی اپنے پروں کے رنگ اس کے ہاتھوں میں چھوڑ کر نہ جانے کہاں اڑ گئی۔ تیز رفتاری میں ہونے والے ایک ایکسیڈنٹ نے شبنم کی دنیا اُجاڑ دی۔ کتنے ہی دن گزر گئے شبنم کو تو جیسے سکتہ ہی ہو گیا تھا اور ہوش اس کو تب آیا کہ جب اس کی ساس شبنم کے گھر اپنا سب سامان واپس لینے آئی۔ شبنم نے دوڑ کر ایسٹی لاڈر کی میک اپ کٹ چھپا دی۔ رنگوں کی اس سوغات کے بغیر تو شاید اس کی زندگی ختم ہی ہو جاتی۔ کیا ایک میک اپ کٹ کے سہارے پوری زندگی گزاری جا سکتی ہے؟ اور پھر شبنم نے کئی سال گزار دیے، ارمانوں کی رتھ تو کئی سال پہلے ہی رُخصت ہو گئی تھی۔ اب صرف ٹوٹے ہوئے خوابوں کی یادگار صرف ایک ایسٹی لاڈر کی میک اپ کٹ شبنم کی دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں تو اماں نے ڈرتے ڈرتے شبنم سے کہا کہ وہ بھی اپنی زندگی کا کوئی راستہ چن لے۔

دور کے رشتہ داروں کے توسط سے شبنم کی شادی ایک متوسط طبقے کے ایک بڑی عمر کے آدمی سے ہو گئی اور شبنم نے اپنے سر کو سفید دوپٹے سے ڈھانپ لیا۔ سخت گرمیوں کے موسم میں املتاس اب بھی بہار دکھاتا تھا مگر شبنم کو سیاہ اور سفید رنگوں کے علاوہ کوئی اور رنگ جچتا ہی نہیں تھا۔ ایسٹی لاڈر کی میک اپ کٹ اب بھی الماری میں کہیں رکھی تھی۔ مگر اب وہ اس کٹ کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتی تھی۔ شبنم کو لگتا تھا کہ کہیں رنگ اسے گھائل نہ کر دیں۔

سرخ، گلابی، کاسنی، نارنجی، سنہری اور روپہلی رنگوں کی ہیئت بھی اب یاد نہ رہی تھی۔ صرف ایک لمحہ ہی تو درکار ہوتا ہے کایا پلٹنے کے لیے۔ وہ ایک لمحہ شبنم کی زندگی میں آ کر گزر گیا اور اب یہ لمحہ ٹھہر گیا تھا جو ٹلنے میں ہی نہیں آتا تھا۔ سیاہ اور سفید رنگ کا لمحہ...... شبنم اپنے اردگرد کی زندگی پر نظر ڈالتی تو رنگوں کی یکسانیت پر حیران رہ جاتی۔

یکسانیت سے بہتے دریا میں وہ منزل بھی آ گئی جب شبنم کی اپنی بیٹی اس کے قد کے برابر آ گئی۔ ایک دفعہ پھر بہاروں نے گھر کے آنگن میں دستک دی تو شبنم نے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میری بیٹی کی سنگھار میز پر ایسٹی لاڈر ضرور سجے گی۔ تقدیر سے لڑ کر شبنم کو اپنی بیٹی کے لیے یہ حق چھیننا تھا...... اور صرف ایک لمحہ ہی تو درکار ہوتا ہے کایا پلٹنے کے لیے۔ صرف اسی ایک لمحے میں شبنم سالوں کا سفر کر کے واپس اپنے آپ میں لوٹ آئی۔ سرخ، گلابی، کاسنی، نارنجی، سنہری اور روپہلی رنگوں نے شبنم کے گرد ایک مضبوط حصار تان لیا۔ شبنم بڑے اعتماد کے ساتھ دکان میں داخل ہوئی تا کہ اپنی بیٹی کی سنگھار میز کے لیے ایسٹی لاڈر خرید سکے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

سردخانہ

شاہد سلیم شاہد/ واکینٹ

نعیم صاحب ہمارے گھر کے برابر میں رہتے تھے۔ پہلے وہ ایک سرکاری اسپتال میں جاب کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ایسا بھیانک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے انہیں یہ جاب چھوڑنی پڑی۔ وہ وجہ کیا تھی کہ انہیں یہ اچھی بھلی جاب چھوڑنی پڑی۔ انہیں کی زبانی سنئے:

میں گھونکی کا رہنے والا ہوں۔ میری فیملی میں مَیں، میری بیوی اور دو بچے شامل ہیں۔

والدہ میری بچپن میں فوت ہوگئی تھیں جبکہ والد صاحب ابھی کچھ عرصے پہلے ہی مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ کلثوم میری خالہ زاد (کزن) تھی۔ ہماری منگنی بچپن میں کر دی گئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد میں بالکل اکیلا ہوگیا تھا۔ میری تنہائی کا احساس کرتے ہوئے میری خالہ نے سادگی سے میرا نکاح کلثوم سے کرادیا۔

کلثوم کے گھر آ جانے سے میری زندگی میں جیسے بہار آ گئی تھی۔ کلثوم نے میرے شب و روز گلزار بنا دیے تھے۔ میں بے حد خوش تھا میری ساری عنایتیں کلثوم کے لیے تھیں۔ خود وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ کچھ عرصے بعد میرے گھر میں ننھے فرشتوں کی آمد نے میرے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا۔ غرض یہ کہ میری زندگی بڑی خوشگوار گزر رہی تھی۔ ہمارے علاقے میں موجود ایک سرکاری اسپتال میں، میں وہاں جاب کیا کرتا تھا۔ میرے گھر سے اس کا دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔

یہ فاصلہ میں پیدل ہی طے کیا کرتا تھا۔ میں اسپتال میں بطور وارڈ بوائے کام کرتا تھا۔ اکثر اوقات میری ڈیوٹی بدل جایا کرتی تھی اور مجھے سردخانے کے باہر پہرہ بھی دینا پڑتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارے علاقے میں یہ واحد سرکاری ہسپتال تھا جہاں ہسپتال کا عملہ ناکافی تھا۔

سردخانے کے باہر پہرہ دینے والی بات کا ذکر میں نے اپنی بیوی سے نہیں کیا تھا کہ اسے میری اس جاب پر اعتراض نہ ہو جائے اسی لیے دن اچھے اور پُرامن گزر رہے تھے۔

میرے دوست نے کبھی مجھے ایک گھڑی گفٹ کی تھی جو انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھی اور مجھے بے حد عزیز بھی تھی۔ میں اسے ہر وقت اپنے ہاتھ پر باندھے رکھتا تھا۔ مجھے اس میں ٹائم دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔

ایک روز میری ڈیوٹی سردخانے کے باہر پہرہ دینے کی لگی تھی۔ گھر میں نائٹ ڈیوٹی کا کہہ کر آتا تھا مگر رات دو بجے میری ڈیوٹی آف ہوجایا کرتی تھی۔

اس رات میں ڈیوٹی پر پہنچا۔ ایک دو ضروری امور انجام دینے کے بعد میں سردخانے میں آ گیا۔ ایک چکر تمام اسٹریچر کے گرد لگایا اور باہر آنے لگا تو مجھے اپنی گھڑی کا اسٹریپ کچھ ڈھیلا لگا۔ میں نے گھڑی اُتاری اور اپنی آستین کے کف اُوپر کیے۔ گھڑی اُتار کر پاس پڑے ایک اسٹریچر پر رکھ دی۔ اس اسٹریچر پر ایک غیر ملکی شخص کی لاش تھی جو ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ لاش تین دن پرانی تھی۔ اب تک اس کے لواحقین نے رابطہ نہ کیا تھا۔ اس لیے اس لاش کو سردخانے میں رکھا گیا تھا۔

انسان کی زندگی میں کیسے کیسے حادثات رونما ہوتے ہیں۔ اس غیر ملکی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کہیں وہ گمنام لاش کی صورت میں کسی انجان جگہ پر لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوگا۔ میں اس کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا کہ نہ جانے کس مقصد کے تحت وہ یہاں آیا ہوگا اور اس مقصد کو انجام دیئے بنا اس دنیا سے رُخصت ہوگیا۔ اس اجنبی غیر ملکی کے بارے میں سوچتے سوچتے میں سردخانے سے باہر آ گیا۔ انچارج کے پاس جا کر اسے اپنے گھر جانے کا بتا کر میں گھر آ گیا۔

گھر آ کر میں نے ہاتھ منہ دھویا اور کھانا کھانے کے لیے دسترخوان پر آ گیا۔ کھانے کے دوران اچانک میری بیوی کی نظر میرے ہاتھوں پر پڑی۔ وہ کہنے لگی ”آپ کے ہاتھ کی گھڑی کہاں گئی؟“

اس کے کہنے پر میں نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا تو واقعی گھڑی کلائی پر موجود نہ تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ گھڑی تو میں نے اُتار کر سردخانے میں رکھے ہوئے اسٹریچر پر رکھ دی تھی اور جلدی میں اسے اُٹھانا بھول گیا اور گھر آ گیا۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر میری بیوی کلثوم بولی ”کیا بات ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“

اس کے ٹوکنے پر میں چونکا اور بولا ”ارے کچھ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

کلثوم بولی ”پھر آپ پریشان کیوں ہیں کیا بات ہے۔ مجھے نہیں بتائیں گے؟“

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں میری گھڑی اسپتال میں رہ گئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ صبح جلدی جا کر لے آؤں گا۔“

کلثوم بولی ”صبح کیوں ابھی جا کر لے آئیں۔ صبح تک تو اسے کوئی اور ہی لے جائے گا۔“

''ارے بھئی میں تھکا ہوا ہوں اس وقت میرا کہیں بھی آنے جانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ رہی گھڑی کی بات تو جس کے نصیب میں ہوگی اسے مل جائے گی۔''

مگر میری بیوی نے میری بالکل نہ سنی اور اس کے بے حد مجبور کرنے پر مجھے گھڑی لینے کے لیے جانا پڑا۔ میں جب اسپتال پہنچا تو چوکیدار مجھے دیکھ کر بولا:

''سب خیریت تو ہے نا تم اس وقت یہاں کیسے؟''

''ہاں سب خیریت ہے مجھے ایک چھوٹا سا کام تھا جس کی وجہ سے مجھے دوبارہ آنا پڑا۔'' میں نے چوکیدار کو اصل وجہ نہیں بتائی کہ وہ نہ جانے کیا سوچتا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال پوچھتا میں آگے بڑھ گیا۔

میں چلتا ہوا سرد خانے کے دروازے پر آیا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میں نے مطلوبہ اسٹریچر کی طرف دیکھا تو مجھے اپنی گھڑی اسی جگہ رکھی ہوئی ملی۔ میں لپک کر اس طرف گیا اور جلدی سے اپنی گھڑی اُٹھائی اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ مڑتے وقت میرا گھٹنا برابر میں رکھے ہوئے اسٹریچر سے ٹکرا گیا۔ میں گرتے گرتے بچا اور جلدی سے خود کو سنبھالا۔ آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آہٹ سی ہوئی ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اسٹریچر پر پڑا ہوا مردہ اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ خوف سے میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا۔ اسی لمحے اس مردے نے اسٹریچر پر سے چھلانگ لگائی اور میری طرف لپکا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اسی مردے نے میری گردن پکڑ لی۔ اس کے مردہ ہاتھوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ میں باوجود زندہ ہونے کے اپنا بچاؤ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اور میں گتھم گتھا رہے۔ اس کے بعد ایک غصیلی نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے وہ مردہ دوبارہ اپنی جگہ سے یہ کہتے ہوئے چلا گیا:

''تیری ہمت کیسے ہوئی مجھے بے آرام کرنے کی؟''

یہ وہ الفاظ تھے جو بے ہوش ہونے سے پہلے میری سماعت سے ٹکرائے تھے۔ پھر اس کے بعد مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔

جب میں ہوش وحواس کی دنیا میں لوٹ کر آیا تو خود کو ایک بستر پر پایا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈیوٹی پر موجود وارڈ بوائے میرے قریب آیا اور حال احوال دریافت کرنے لگا۔ اتنے میں ایک اور ڈاکٹر جسے میں اچھی طرح جانتا تھا وہ آیا اور پوچھنے لگا۔

''تم سرد خانے میں اتنی رات گئے کیا کرنے لگے تھے؟'' تب میں نے انہیں سرد خانے میں جانے کی وجہ تفصیل سے بتادی جسے سن کر وہ بہت حیران تھے میری بات سن کر کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے میرا چیک اپ کرنے کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے ایک دوست کی مدد سے گھر پہنچا۔ وہاں میری بیوی نے الگ ایک طوفان کھڑا کر رکھا تھا جس کی تفصیل یہاں بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ جس گھڑی کی وجہ سے میں اتنی پریشانیوں سے گزرا یا یوں کہنا چاہیے کہ اتنے خوفناک حالات سے گزرا وہ گھڑی صحیح وسالم میرے پاس موجود ہے۔ اس غیر ملکی شخص کی لاش کا کیا بنا مجھے کچھ پتا نہ چل سکا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد میں نے وہ جاب ہی چھوڑ دی تھی۔

آج میں ایک کریانے کا اسٹور چلا رہا ہوں۔ گزر بسر اچھی ہو رہی ہے لیکن اس رات سرد خانے میں گزرے وہ لمحات میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکا ہوں۔ وہ رات جب بھی یاد آتی ہے خوف سے میرا رواں رواں کانپ اُٹھتا ہے۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

مگرمچھ

نوین روما/لاہور

گھٹیا، بے حیا ذلیل کمینہ گالیاں کم پڑ رہی تھیں جتنے گندے اور برے الفاظ ذہن میں لا سکتی تھی وہ لا رہی تھی۔ دُنیا کا سب سے گندا لفظ کون سا ہو سکتا ہے جو میں اس آدمی کے لیے بول سکوں دل کانوں کے رستے باہر آ رہا تھا سانس تیز اور ہاتھ ٹھنڈے۔۔۔۔

آج میں ایک سال بعد اپنے شوہر کے آفس آئی تھی بچے کی پیدائش سے کافی پہلے میں نے آنا چھوڑ دیا تھا بقول ان کے اتنا بڑا پیٹ لوگوں کو نہیں دیکھاتے اور پھر اس کے پیدا ہونے اور تین چار ماہ گزرنے کے بعد آج اتفاق میں آئی تو انہوں نے میرا بڑا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ آپ کے آنے سے میرا دل ہمیشہ بڑا ہو جاتا ہے میں اپنے آپ کو بھرا بھرا محسوس کرتا ہوں انکی باتیں ہمیشہ کی طرح میٹھی ہوتیں۔ چائے منگواؤں آپ کے لیے؟ سیماب نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''ہاں کیوں نہیں''، میں نے خوشی سے کہا۔ ہاں پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں مغرب کی نماز پڑھ آؤں تو دونوں ایک ساتھ پیتے ہیں؟ یہ تو اور بھی اور بھی اچھا ہے میں نے خوشی سے کہا۔۔۔ وہ وضو کے لیے گئے اور پھر جلدی سے نماز کے لیے قریبی مسجد چلے گئے ۔سیماب ہمیشہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ میں آرام سے صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی سیماب کتنے اچھے نیک خوش شکل اور خوش دل ہیں اللہ کا جتنا شکر کروں کم ہے۔ سیماب اکثر کہتے تھے کہ نیک مردوں کے لیے نیک اور بدمردوں کے لیے بری عورتیں ہوتیں ہیں۔ آپ اچھی ہیں تو میں اچھا ہوں اور پھر کچھ گنگنانے لگتے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور سوچا بس کچھ ہی دیر میں وہ آ جائیں گے تو چائے پی کر گھر چلتے ہیں۔ سیماب اپنا کمپیوٹر آن چھوڑ گئے تھے۔ ان کے میسج کی مسلسل ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی رُک ہی نہیں رہی تھی ۔ میں نے قریب ہو کر دیکھا تو نیچے فیس بک پر میسج آئیکون بنا تھا جس میں 25,30,37 کا ہندسہ عبور کرتے کرتے 48 کی سطح کو جا پہنچا تھا۔ ایکبار میں اتنے سارے، سیماب تو زیادہ استعمال بھی نہیں کرتے۔ میرے دل میں نا جانے کیا آیا میں نے ماؤس سے اُسے کلک کر دیا فوراً ہی ان کا پیج کھل گیا ۔ جیسے ہی میسج کا پیج کھلا ایک طویل لائن تھی پیغامات کی ۔ میرا تجسس بڑھتا گیا۔ لیکن مجھے فوراً ڈر آ گیا۔ پھر بھی بیوی تھی آخر میں نے کرسی آگے کی اور بیٹھ گئی طویل لائن اور سارے کے سارے پیغامات خواتین کے ہو سکتے ہے کام کے سلسلے میں ہوں اور جلدی سے انہیں اوپن کرنا چا رہی تھی۔ سب سے پہلا پیغام ایک Angel خاتون کا تھا۔ کیسے ہو میرے ہیرو؟ ایک بے سروپا سی عورت کی تصویر لگی تھی اوہو جناب کہاں چلی گئی تھی آپ؟ سیماب کا نیچے جواب تھا۔ بس آج کل اپنے آپ کو فٹ کر رہی ہو۔ سلم اور جم جوائن کیا ہے۔ عورت نے لکھا تھا اُو ہو لیکن مجھے کیا فائدہ ایسے سمارٹ ہونے کا سیماب کا Reply یہ تھا بند کر دیا اسے بکواس ہے یہ۔۔۔ لیکن ساتھ ہی اگلا میسج کھولا۔ آسیہ Tigeress کے نام سے لڑکی کا پیغام تھا، آپ کہاں ہیں، میں آپ کے آفس بھی آئی کوئی نہیں تھا فون بھی کیے او ہو سوری یار کال کیا کرو پھر آنا۔ سیماب نے جواب دیا۔ ok نمبر send کرو اور Asia Tigeres، یار ایسے نہیں بولتے بے وفا۔۔ غائب ہوگئی۔ ہم نے تو تم سے پیار کیا تمہیں چوما تھا گلے سے لگایا تھا پیار کیا تھا وہ سارے حسین پل بھول گئی۔ سیماب کا سوال تھا۔۔۔ اچھا آؤں گی۔۔ نہیں یہ سیماب نہیں ہیں یہ کوئی فیک آئی ڈی ہے۔ میں نے فوراً اُوپر دیکھا سیماب لکھا تھا اور ساتھ ان کی اپنی تصویر۔۔۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے نیچے والے کو کلک کیا Dr Saima کا سلام، ہائے جانو! کیسے ہو میری جان کہاں چلے جاتے ہوں؟ آپ کے قدموں میں۔۔ آپ کا سیماب۔۔۔ سیماب ہم ایک ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے ہیں مجھے یقین نہیں آتا، میرے سے دور نہ جانا ساری زندگی ساتھ نبھانا۔۔۔ انشااللہ آپ کے ساتھ ہوں Love You۔۔۔ کیسے یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کسی نے غلط لکھا وہ ایسے کیسے لکھ سکتے۔۔ مجھ بلکل یقین نہیں آ رہا تھا میں یکدم کھڑی ہو گئی جا کر دروازہ بند کر دیا۔ کہیں سیماب فوراً اندر نہ آ جائیں لیکن میں نے پھر سلسلہ وہاں سے شروع کیا۔ ایسے کتنے پیغام مختصر طویل جس میں Hi janu، Love you آؤ نہ پیار کریں۔۔۔ یاد آتی ہے Miss you ۔۔۔ آخر میں لڑکی کا پیغام تھا۔۔۔ ثنا خان، سر کیسے ہیں، آپ جیسا سیماب کا جواب، سر مجھے کچھ پیسے چاہیں، ثنا نے لکھا، کتنے حکم؟ سیماب نے خوش ہو کر لکھا۔ آ کر بتاؤں گی، ثنا خان۔ آتی ہو تو شرماتی ہو، تمہارے بالوں کو ہاتھ لگاؤں تو تمہیں کرنٹ پڑ جاتا ہے۔ ایسے نہ کروں ویسے نہ کریں۔۔۔ سیماب نے بے شرمی سے کہا۔ سر آپ پر کیا جن آ جاتا ہے نہیں آپ کیسی باتیں کرتے ہیں اور پھر ثنا آف لائن ہو گئی۔ یہ لڑکی سیماب کی سیکرٹری تھی اور اُسے زیادہ لفٹ نہیں کرواتی تھی ساری گفتگو سے تو ایسا یہ لگا۔ میں پڑھتی گئی محبت، چاہت، تنہائی میں گزرے لمحوں کی تفصیلات پتا نہیں اس میں کیا کچھ تھا۔ باہر کچھ آہٹ ہوئی میں نے فوراً کمپیوٹر ویسے ہی کر دیا اور جلدی سے دروازہ کھول کر واپس صوفے پر آ بیٹھی۔ سیماب اندر آئے اونچی

اونچی آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتے درود پڑھتے میرے پاس آ کر میرے چہرے پر پھونک ماری۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ مسکرائے اور بولے کیا ہو رہا تھا، کچھ نہیں میں نے ڈگمگاتے ہوئے بولا، کچھ وقت پہلے پڑھنے والی chat آنکھوں کے گرد ناچ رہی تھی الفاظ ہوا میں اُڑتے لگ رہے تھے۔ دیکھو تمہارا شوہر کتنی مشقت کرتا ہے بس یہ وقفہ ہی لیتا ہوں نماز پڑھنے کا۔۔۔ سیماب صوفے سے ٹیک لگا کر بولے۔ ہاں وقفہ برائے نماز۔۔ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا اور دل میں سوچا وقفہ برائے نماز کتنا بڑا وقفہ لے آیا ہم دونوں کے بیچ بس میں گھر چلتی ہوں، پیٹ میں سخت درد ہے میں نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا، کیوں کیا ہوا کچھ دیر بیٹھو ایک ساتھ جائیں گے ، سیماب حیران ہو کر بولے۔،،، آپ بعد میں آ جانا، میں باہر کی طرف نکلی۔ او کے، ٹھیک ہے، دھیان سے جانا سیماب باہر دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے میں جلد جلدی سیڑھیاں اُترنے لگی میرا وہاں دم گھٹ رہا تھا یہ وہی جگہ تھی جہاں پہروں بیٹھنا میری خواہش رہی تھی آج وہاں پل بھر میں جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ سیماب میری محبت میرے شوہر ہم نے محبت کی شادی کی، وہ سنجیدہ مزاج عالمانہ گفتگو کرنے والے اللہ سے محبت اس کا ڈر ایسی باتیں یہ کس طرح کا روپ آج میں نے دیکھا،،، زور زور سے چیخنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن کچھ نہ کر سکی بے وفا،،، اور اتنی ساری خواتین کے ساتھ کیوں آخر کیوں؟ ایک عورت سے زندگی بہتر نہیں ہوتی؟ کوئی کمی میرے میں نہیں ،،، کمیاں بھی ہوں تو کیا محبت کے آگے کچھ نہیں چلتا۔۔ ہمارے تین پیارے پیارے بچے،، اُف اللہ مجھے کچھ دکھائی ،سنائی اور سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ سیماب کا چہرہ نوچ دینے کو دل کر رہا تھا، اسے ماروں اور مارتی جاؤں کیا سزا دوں اسے؟ ایسی سزا کی اس کے دل کے پرخچے اُڑا دوں مزا چکھا دوں اسے میں روتی دھوتی گھر پہنچ

گئی۔ کسی کام میں کسی چیز سے میری حالت صحیح نہیں ہو رہی تھی۔ رات کو دس بجے سیماب گھر آ گئے میں نے سر درد کا بہانہ کر کے جلدی سونا ہی بہتر سمجھا، آنسو تھے کہ کسی طرح رک ہی نہیں رہے تھے۔ نہیں جانتی تھی کہ ایسا کیا ہوگا کہ میرے دل کو سکون ملے میں زندہ رہ سکوں۔ صبح آنکھ کھلی تو چھت سے لٹکائے جانے والا پنکھا نظر آیا اور ساتھ ہی ایک لفظ کانوں میں گونج رہا تھا بدلہ،،، سیماب تم اس پنکھے جیسے ہو سفید رنگ کے پنکھے پر لگے جالوں کی طرح اللہ کو اتنا کیوں یاد کرتے ہو۔ لوگوں کو بتانے کے لیے تم اچھے ہو یا اللہ کو۔۔ یا تم صحیح کر رہے ہو نہیں نہیں سب بکواس باتیں ہیں کیا کروں کیا کروں، ایک خیال نے میری دنیا ہی بدل دی میں ایک جھٹکے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی بال باندھے سیدھی نہانے چلی گئی بہت دیر تک نہائی، خوب سارا ناشتہ کیا، سیماب پتہ نہیں کب خود ہی ناشتہ کر کے چلے گئے ، بہت سا میک اپ کیا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی میری زندگی میری ہے، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کے اس پر ظلم کرو سیماب حسن ''اب تمہیں پتہ چلے گا'' میں نے انتہائی جوش وخروش سے لیپ ٹاپ آن کیا فیس بک کا پیج جیسے ہی سامنے آیا میں نے نیو اکاونٹ بنانا شروع کیا،،، ''تنہادل'' کے نام سے ایک آئی ڈی بنائی میں ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے کامیابی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ لیا ہو۔ تنہا دل کی ایک اُداس سے تصویر لگائی ایک خوبصورت لڑکی شام کے منظر میں بیٹھی پھولوں سے اپنا آدھا چہرہ ڈھانپے بیٹھی تھی۔ انٹرنیٹ سے مختلف تصاویر جمع کر کے میں نے اپنی البم میں لگانی شروع کیں کوئی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دو تین فرینڈ ریکوسٹ بھی آ گئیں میں تو بہت ہی خوش ہوئی ،شام تک یہ تعداد تیس تک پہنچ گئی۔ اتفاق سے سارے مرد تھے اور میری خوب تعریف ہو رہی تھی میں نے ایک ہی فرینڈ ریکوسٹ کی اور وہ سیماب کو دیکھنا چاہتی تھی وہ کس حد تک گر سکتا ہے شام سے رات

ہونے والی ہوگئی لیکن میں نے تقریباً سارا دن ہی آن لائن رہی بہت سے لوگوں سے باتیں ہو رہی ہیں، مجھے نہ تو کھانا پکانے کی ہوش رہا نہ کوئی گھر کا کام کیا بچے امی کے گھر تھے ان کو بھی Pick up نہ کر سکی رات کو سیماب گھر آئے تو کھانا بھی نہیں تھا میں نے طبعیت خراب ہونے کا بہانہ کیا تو وہ باہر سے لے آئے، میں نے سوچا کچھ دن امی کے گھر چلی جاتی ہوں وہاں سکون سے اپنے پلان پر کام کروں گی ، ویسے بھی سیماب کے ساتھ ایک بستر پر سونے سے مجھے وحشت ہو رہی تھی اور جب تک اپنے دل کی آگ کو اس کے سینے میں منتقل نہ کر دوں سکون نہیں ملے گا۔

بی جان کی گود میں سر رکھ کر کتنا سکون ملا جیسے سارے دُکھ غائب ہوگئے۔ بی جان سب بدل کیسے جاتا ہے کیا ہر چیز کو زوال ہے؟ ہم نے ایک دن مر جانا ہے تو کیا ہر رشتے کو احساس کو Feelings کو اور محبت کو بھی موت ہے۔ بی جان نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا جیسے کہ Infrirad app سے سب کچھ جان گئی ہوں، نہیں ، بیٹا موت تو ایک جگہ ٹھہر کر دوسری جگہ جانے کا نام ہے رشتے اور جذبے بھی مرتے ہیں بلکہ ہمیں آزماتے ہیں رُخ بدلتے ہیں بس انتظار کرنا چاہیے۔ سب باتیں ہیں ۔ بے جی سب عجیب ہے مجھے تو ہر چیز بے اعتبار لگتی ہے بے جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس نرم اور ٹھنڈے ہاتھوں سے میرے بال سلجھاتی رہیں۔ دو دن گزر گئے ہیں اور لیپ ٹاپ میں سارا دن انٹرنیٹ پے ہوتی بچے، گھر، کھانا، کپڑے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا اب میں نے بہت سے لوگوں سے دوستیاں کر لی تھیں اور ان سب کا ایک ہی مقصد تھا عورت سے صرف عورتوں والی باتیں کی جائیں۔ اس کا فکر کیا ہے وہ کیسے لائف گزار رہی ہے Extra Mentioned Affairs ایک وقت ہی کئی کئی لڑکیوں اور لڑکوں سے دوستیاں یہ سب اسی چیز کی دنیا تھی اور اپنا غم دور کرنے کے لیے اس

سے بڑی دُنیا میرے لیئے اور کوئی نہیں تھی بہت طویل لسٹ میں سے میں نے تین لوگوں سے دوستی کی۔ دو میرڈ تھے اور ایک سٹوڈنٹ (سلیم اپنی بیوی کے موٹا ہونے پے اور بدتمیزیوں سے چالو تھا اسی لیے ہروقت میرے سے میری سمارٹنس کا پوچھتا اور سیلفی بنا کر بھیجو تم کیسی لگ رہی ہو، ہاٹ یا سمپل موٹے پیٹ والی عورت اسے زہر لگتی میں اس سے Chat کرتی اور اپنی سمارٹنس کے بارے میں بتاتی وہ ہروقت صرف ایک چیز کے بارے میں بات کرتا Men & Women Relations، ویب کیم آن کرو یار Live آجاؤ، انجوائے کرو یہ دنیا بدل گئی ہے اچھا کال کرتا ہوں، ملتے ہیں، آج شام Long Drive پے چلیں گے اور میں اس سے ملنے کے لیے نکل پڑی، شام کو پارک میں واک کریں گے اور تھوڑی سی Long ڈرائیو۔۔ میں قریبی پارک میں شام کو واک کے لیے نکلی تھی، سلیم کی گاڑی گیٹ کے عقب میں نظر آئی۔ لیکن اسکی گاڑی تک ابھی پہنچی نہیں تھی کہ اس کی کال آگئی یار میری بیوی بھی اسی پارک میں بچوں کو لے کر آتی ہے میری گاڑی دیکھ لی ہے خدا حافظ۔۔ اور پھر اسے میں نے فرینڈ لسٹ میں سے ڈیلیٹ کر دیا۔ دوسرا دوست ایک سٹوڈنٹ تھا بولا میرے اپارٹمنٹ آؤ میرے پاس کمال میوزک کولیکشن ہے خوب سارا میوزک سناؤں گا اپارٹمنٹ کی طرف جارہی تھی تو اس کی کال آئی یار میرے گھر والے اور کزنز Surprise Visit پے آگئے ہیں ہم دو تین دن بعد ملتے ہیں، ہائے ۔۔۔ وہ بھی ڈیلیٹ، تیسرے دوست نے مجھے اپنے آفس بولایا، یار آج شام آؤ نا۔۔ میں بہت اچھے سے تیار ہوئی، بس سیماب کا دل جلا دوں تباہ کر دوں وہی درد دوں جو اس نے مجھے دیا ہے، مزا چکھا دوں۔۔ جیسے ہی سڑک پار کی اور اسکے پلازہ کے قریب پہنچی، Fire Brigade کی گاڑیوں کا شور بڑھتا گیا اس پلازہ کے بیسمنٹ میں آگ لگی تھی اور سارا Area بلاک کر دیا گیا۔ میں وہیں سے لوٹی اور گھر آگئی میں بوجھل قدموں سے آئی میں ایک لوٹے ہوئے تارکین وطن کی طرح تھی جسے پتہ ہی نہیں تھا وہ کہاں اور کیوں کس سمیت جارہا ہے، برآمدے میں آکر بے جی کی گود میں لیٹ گئی۔ بے جی! کیا نیک عورت کے لیے نیک مرد اور بری عورتوں کے لیے برے مرد ہوتے ہیں؟ بے جی! کی پر سکون آنکھوں میں ایسے ایک ستارہ چمکا جیسے چھوٹی سی کھڑکی میں چاندنی رات میں ایک تارہ نظر آتا ہے۔ میری جان یہ قدرت ہی جوڑ ملاتی ہے نصیب ہی سب جانتے ہیں اور جوڑے اوپر بنتے ہیں۔ بے شک اچھے لوگوں کو اچھے ہی ملتے ہیں یہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے اس لیے ان کا وقت اچھا گزرتا ہے اور جہاں تک برائی کی بات ہے اس کا تعین کون کرے گا کہ دوسرا اچھا ہے یا برا اور اگر برا ہے تو کیا میں اچھا ہوں شاید میں بھی بُرا ہوں لیکن مجھے اپنی برائی نظر نہ آرہی ہو تمہارے ابا کیا کرتے تھے دوسرے کی برائی دیکھ کر اپنے آپکو برا نہیں کرتے اور میری گڑیا مرد کا کیا ہے وہ تو نہایا دھویا ایک گھوڑا ہے اپنی موج میں رہتا ہے ایسا منہ زور گھوڑا ہے اسکی لگامیں تو کوئی بھی نہیں کھینچ سکتا۔ بات تو صرف عورت کی ہے اسے بس اچھا رہنا ہے ہر حال اچھے مرد کے ساتھ بھی اور برے مرد کے ساتھ بھی عورت تو غلط بات سوچ بھی لے تو سمجھو اس نے وہ کر دیا۔ بے جی کی باتیں کہیں دور سے آتی لگ رہی تھی بالکل ایسے جیسے میں آپریشن ٹیبل پر لیٹی ہوں ڈاکٹر کہہ رہا ہے لمبے لمبے سانس لوں،،، ون ٹو تھری پھر تھری کہتے ہی مجھے سارے نقش دھندے دیکھائی دے رہے ہوں اور ہر حرف بی جی کی شکل نظر آرہی ہے۔ اب کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے کچھ بول سکتی ہوں یہ میں کہاں ہوں بُرے مرد کے لیے بُرے عورت بن جانے سے کیا وہ مجھے قبول کرے گا وہ بُرا ہو کر بھی اچھا رہے گا اور میں کچھ نہ کر کے بھی بری۔ لیکن تم نے کیا تو اس راستے پر چلنا تو شروع کیا اسکی شروعات تو کی۔ تم بھی بُری ہو اس لیے تمہیں ایسا آدمی ملا سارا گھر پانی میں تیرتا دیکھائی دے رہا تھا اور بی جی کی آواز میرے ساتھ ساتھ تھی میری گڑیا عورت کو ہی اچھا ہونا ہے ہر حال میں، یہ نر کسی کا نہیں، نر جانور تو اپنے ہی بچے مار ڈالتے ہیں۔ میں گرتی ڈگمگاتی ڈولتی اپنے کمرے کی جانب گئی میرے قدم میری سانسیں ساتھ نہیں دے رہی تھی، صوفے پر بیٹھ کر میں چھت میں لگے پنکھے کو دیکھنے لگی ماں بھی اس پنکھے جیسی ہی اس نے بس ٹھنڈی ہوا دیتی ہے اور گرد کتنے یہ جانے لگے ہوں وہ صرف اچھائی بانٹے گی ٹی وی پر اینیملز ڈاکومنٹری چل رہی تھی مگر مچھ بڑے بڑے مگر مچھ جھیل میں تیر رہے تھے دو بڑے مگر مچھ ایک نر ایک مادہ اردگرد چھوٹے چھوٹے بچے مادہ کا رُخ دوسری طرف تھا اور نر کچھ چبا رہا تھا۔ جیسے ہی مادہ مگر مچھ دوسری طرف کھسکی وہ چھوٹے بچے کی طرف لپکا اسے پکڑنا چاہا، مادہ جب بھی واپس مڑتی وہ پیچھے ہٹ جاتا تھوڑی دیر کے لیے مادہ پانی میں اُتری اب نر کے پاس بہت اچھا موقع تھا وہ ننھے بچے کو نگل لے وہ اسکی طرف لپکا بچہ بار بار ہل رہا تھا، میرے بیڈ پر پڑے لیپ ٹاپ کی لائیٹ بلنک ہوئی، فیس بُک کے میسج ٹک ٹک بڑھتے جارہے تھے۔ ٹک ٹک کی آواز، میں ایک جھٹکے میں اُٹھی اور لیپ ٹاپ کی طرف لپکی Central Table مجھے نظر نہیں آئی میں منہ کے بل میز پر گری۔ سارا منہ خون سے بھر گیا میرے ہونٹ زبان دانتوں میں بری طرح کٹ چکے تھے سارے چہرے پر خون تھا۔ لیکن مجھے اپنے لیپ ٹاپ تک پہنچا پایا تھا اس سے پہلے مگر مچھ اِس آخری بچے تک پہنچا اور اسے ہڑپ کر جاتا مجھے اپنے فیس بُک کا اکاونٹ ڈیلیٹ کرنا تھا۔

امجد اسلام امجد/لاہور

یونہی وحشت میں ہم خاک اُڑاتے رہے آتے جاتے رہے
کوئی ساتھی نہ تھا کوئی منزل نہ تھی کوئی رستا نہ تھا

بند ہو جائے گی ایک دم زندگی ایسے سوچا نہ تھا
یہ جواَب ہوگیا خواب میں بھی کبھی ہم نے دیکھا نہ تھا
چار دن سیر کی ہم نے بازار کی لوٹ کر آ گئے
اپنے وارے میں کچھ بھی نہیں آ سکا کچھ بھی سستا نہ تھا
یوں ہی وحشت میں ہم خاک اُڑاتے رہے آتے جاتے رہے
کوئی ساتھی نہ تھا کوئی منزل نہ تھی کوئی رستا نہ تھا
جو بھی جیسے ہوا سب کو معلوم تھا سب کے تھا سامنے
شہر بیدار میں کوئی سویا نہ تھا کوئی اندھا نہ تھا
اپنی خواہش تو تھی زندگی کو جئیں بات بن نہ سکی
بات بنتی بھی کیا دل میں ہمت نہ تھی سر میں سودا نہ تھا
اس گھر میں ہوئے حادثے کی خبر دوسروں سے ملے
اپنے ہمسائے سے اس قدر فاصلہ پہلے ہوتا نہ تھا
پٹریوں پر کھڑے، ہر طرف ہر جگہ بے خبر لوگ تھے
پاس آتی ہوئی ریل کی سیٹیاں کوئی سنتا نہ تھا
کوئی آمر نہیں، سوچ کو قید میں، جو سدا رکھ سکے
سچ کو جو روک لے، کوئی زندان میں، ایسا پہرا نہ تھا
کتنے موتی یہاں قدردانوں کی رہ دیکھتے رہ گئے
ساحلوں پر بکھرتی ہوئی سیپیاں، کوئی چنتا نہ تھا
کوئی تھک کر گرے اور باقی اسے روند کر چل پڑیں
جانے کیا موت تھی ان کے پیچھے پڑی کچھ بھی کھلتا نہ تھا
ہم نے امجد بہت سب کو آواز دی، ہاتھ پکڑے بہت
وقت کی رہگذر ایسی ڈھلوان تھی کوئی رُکتا نہ تھا

رزق اور عشق تھے اس طرح روبرو کوئی میں تھا نہ تھا
آئنے آئنوں سے اُلجھتے رہے کوئی چہرہ نہ تھا
تم کہو اور تارے نہ بدلیں وہیں، یہ تو ممکن نہیں
جو تمہیں دیکھ کر پھر کہیں دیکھتا کوئی ایسا نہ تھا
دل تھا خالی مکاں جس میں چیزیں تھی کم اور جالے بہت
ماسوا یاد کے، مدتوں سے وہاں کوئی ٹھہرا نہ تھا
کیا خبر تھی کے یوں دائرے دائروں کو نگل جائیں گے
ہر طرف بھیڑ سی ایک اپنوں کی تھی، کوئی اپنا نہ تھا
بے وفا لوگ تو، شہر میں کچھ نہ کچھ تھے ہمیشہ سے ہی
کوئی ڈھونڈے سے بھی باوفا نہ ملے، یار ایسا نہ تھا

ریل کا پھاٹک

بن محافظ کھلے
ریل کے ایک پھاٹک سی ہے زندگی
جس کے دونوں طرف
خواب میں جاگتی بھیڑ سی ہے رواں
جس کو یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں
کس کو جانا ہے کب، کس طرف اور کہاں!
اور لگی تھی یہاں
جس محافظ نما شخص کی نوکری
وہ بھی چھٹی پہ ہے
پاس آتی ہوئی ریل کی سیٹیاں
کوئی سنتا نہیں
پٹریوں سے گزرتی ہوئی خلق کو
وقت پر روک لے، کوئی ایسا نہیں
ایک سگنل کہیں جلتا بجھتا تو ہے
کوئی اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں
دیکھ بھی لے اگر، سوچتا ہی نہیں
ریل کے ہر دفعہ آنے جانے پہ یہ
گرتا اُٹھتا ہے کیوں!
اس کا مطلب ہے کیا یہ سمجھتا نہیں
ریل کو سامنے دیکھتا ہے مگر
پھر بھی رُکتا نہیں
کیسا سگنل ہے یہ
جس کے پیہم اشارے بدلنے سے بھی
کچھ بدلتا نہیں
بے محافظ، کھلے
ریل کے ایک پھاٹک سی ہے زندگی
جس کے دونوں طرف
بھیڑ تو ہے مگر
کوئی بڑھ کر اسے بند کرتا نہیں!

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بُک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

فروغِ ادب کے لیے وقف
براہِ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری ونثر) کمپوز کروا کے ''ان پیج'' میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com
آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ-/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔
برائے خط کتابت/ ترسیل زر / رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794 - 042-37322996

غزالی / گوجرہ

چاہت کے باوجود بھی ہم تم نہ مل سکے
کیسا یہ درمیاں میں خلا رکھ دیا گیا

مجھ کو ترے قریب یہ کیا رکھ دیا گیا
سورج کے ساتھ جیسے "دِیا" رکھ دیا گیا
سر اور سجدے لازم و ملزوم ہو گئے
جب سے تمہارا نام خدا رکھ دیا گیا
اس عہدِ نو نے ہم کو گوارا نہیں کیا
ماضی کی داستاں کو جدا رکھ دیا گیا
مشکل سفر کو سہل بنانے کے واسطے
رہزن کا نام راہنما رکھ دیا گیا
چاہت کے باوجود بھی ہم تم نہ مل سکے
کیسا یہ درمیاں میں خلا رکھ دیا گیا
پہلے ہمیں دکھائے گئے خوابِ روشنی
پھر طاق میں بجھا کے "دِیا" رکھ دیا گیا
اُگتے ہیں روز مجھ میں غزالی گلابِ فکر
جانے یہ اس چٹان میں کیا رکھ دیا گیا

تمہاری یاد، پرندے، ہوائیں، دروازے
دیارِ فکر میں کھلتے ہی جائیں دروازے
وہ خوش نصیب ہیں بیٹے، نصیب ہیں جن کو
عظیم مائیں، مقدس دُعائیں، دروازے
یہ بے مکانی کے شانوں پہ بے نوا لاشے
خدا کرے کبھی ان کو بلائیں دروازے
لگا رکھی ہے فدایانِ زر نے پابندی
کسی غریب پہ کھلنے نہ پائیں دروازے
گھروں کے بھیدی لٹیروں سے مل چکے ہیں یہاں
گھروں کو لٹنے سے کیسے بچائیں دروازے
سجایا جن کے ہنر نے حویلیوں میں انھیں
انھیں غریبوں کو آنکھیں دکھائیں دروازے
ہوس کا عکس مقید ہو کیسے شیشے میں
گناہ کیسے گھروں کے چھپائیں دروازے
نجانے کون ہے وہ جس کی یاد ہے باقی؟
نجانے دیتے ہیں کس کو صدائیں دروازے؟
میں جاؤں بن میں غزالی تو کاٹے تنہائی
نگر میں آؤں تو کھانے کو آئیں دروازے

ٹوٹتے جاتے ہیں پیمان تمہارے سارے
بجھتے جاتے ہیں اُمیدوں کے ستارے سارے
کوئی زحمت کسی دشمن کو اُٹھانی نہ پڑی
مہرباں ہم پہ رہے دوست ہمارے سارے
عصرِ موجود کی بے رحم ہوا کے جھونکے
لے گئے چھین کے بچوں کے غبارے سارے
وسعتِ فکر و تخیل کے سزاواروں نے
تنگ دستی میں شب و روز گزارے سارے
ایک اک کر کے جدا ہو گئے یارانِ حسیں
وقت نے چھین لیے دل کے سہارے سارے
راکھ ہی راکھ اُڑی پھرتی ہے دل میں ہر سُو
جل گئے آپ کی یادوں کے شمارے سارے
تیرے ہر ظلم کا سہنا پڑا طعنہ مجھ کو
قرض تجھ پر تھے مگر میں نے اُتارے سارے
سب ترے نام غزالی ہیں منافعے میرے
ڈال دے تو میرے کھاتے میں خسارے سارے

خبر ملی ہے مجھے شہر کی ہواؤں سے
وہ شخص میری طرف آ رہا ہے گاؤں سے
زمیں پہ ثبت کیے جائیں دستخط اپنے
کہ ہم کو لوٹ کے آنا بھی ہے خلاؤں سے
عبارتوں سے معانی جدا ہیں کچھ ایسے
کہ جیسے بچھڑے ہوئے "لال" اپنی ماؤں سے
کسی کی سرمئی زُلفوں سے گفتگو کر لوں؟
اسے شامِ ہجر! تری سانولی ہواؤں سے
ہماری کھیتیاں برسات نے جلا ڈالیں
کہ اب کے آگ برستی رہی گھٹاؤں میں
محاذ سے نہ ہٹے میرے ولولوں کے چراغ
شہید ہو گئے لڑتے ہوئے ہواؤں سے
حروف جب سے غزالی اثر سے خالی ہیں
قبولیت بھی پرے ہو گئی دُعاؤں سے

آندھی کے نظر آئے جو آثار زیادہ
خطرے میں تھا ہر نخلِ ثمردار زیادہ
لشکر کبھی اُس جنگ میں جم کر نہیں لڑتا
جس جنگ میں لشکر کے ہوں سالار زیادہ
تھوڑا سہی مجھ پر غمِ دنیا کا بھی حق ہے
مصروف نہ کر مجھ کو غمِ یار زیادہ
جینا ہے تو سامانِ تعیش میں کمی کر
مرنا ہے تو دولت سے نہ کر پیار زیادہ
بنیاد یہی حادثہ ہے پستیٔ فن کا
بنتے چلے جاتے ہیں جو فنکار زیادہ
کوتاہیٔ ہمت سے تھا مجبُور میں ورنہ
اُونچی تو نہ تھی ہجر کی دیوار زیادہ
افواہیں مرے شہر میں ہیں عام غزالی
چھپتے ہیں مرے شہر میں اخبار زیادہ

محمد آصف انصاری/لاہور

ساری باتوں کا یہ خلاصہ ہے ۔۔۔ عشق سب سے بڑا دلاسہ ہے

میں نے خود کو اُسی میں ڈھالا ہے
اُس نے کتنا مجھے سنبھالا ہے
چاند، خوشبو، جمال، خوش رنگی
سب اُسی شخص کا حوالہ ہے
اُس کی باتیں تو بس پہیلی تھیں
اس کی آنکھوں نے حل نکالا ہے
میرے شعروں میں جھوٹ شامل تھا
اپنے لفظوں کو بیچ ڈالا ہے
بات کیسے نہ معتبر ٹھہرے
لاکھ جذبوں کا یہ ازالہ ہے
میں نے ماضی کا حال پوچھا تھا
ہنس کے بولا کہ بخت کالا ہے
یوں ہی خوش حال تو نہیں ہوں میں
اپنے ہاتھوں سے وقت پالا ہے

میں بہت دور تک نہ جاؤں گا
ہاں مگر ہم سفر بناؤں گا
میری آنکھوں سے رابطہ رکھنا
تجھ کو بھی دیکھنا سکھاؤں گا
بوڑھی ہو کر کبھی ملی جو تم
اپنے بچوں سے بھی ملاؤں گا
گھر سے باہر کہاں گیا تھا میں
اپنے بچوں کو سچ بتاؤں گا
اب مجھے روشنی میسر ہے
دیر تک شب کو جگمگاؤں گا
اسی وعدے پہ دوستی ہوگی
ساری باتیں نہیں بتاؤں گا
میری اماں کی اس نے خدمت کی
ناز بیوی کے سب اُٹھاؤں گا

ساری باتوں کا یہ خلاصہ ہے
عشق سب سے بڑا دلاسہ ہے
اپنی مٹی سے جڑ کے رہتے ہیں
عالی ظرفوں کا یہ بھی خاصہ ہے
ساری دنیا کو کیسے بہلائے
گویا دولت کوئی رقاصہ ہے
سیدھا منزل پہ جائے گا وہ ہی
بوجھ کندھوں پہ جس کے خاصا ہے
کل امیری کے دعوے کرتا تھا
آج ہاتھوں میں اُس کے کاسہ ہے
ہجر جھیلے تو وصل بھی جھیلے
یوں تو کہنے کو دل ذرا سا ہے

یوں تو کہنے کو سب فسانے ہیں
ان میں پنہاں کئی زمانے ہیں
عشق، دولت، حصولِ شہرت بھی
زیست کرنے کے سب بہانے ہیں
اب کے سوچا ہے یوں بھی کرنا ہے
اپنے جذبوں کو پر لگانے ہیں
میں نے سوچا ہے آج خود کو بھی
مجھ میں یادوں کے صد خزانے ہیں
اُس کے حصے میں راحتیں ہوں گی
میرے حصے میں شعر آنے ہیں
ایک بیوی، کتاب، دو بچے
میری دنیا کے کل خزانے ہیں

پاس رکھیے شاعری میں لفظ کی توقیر کا
دیکھیے پھر آپ ہی خود معجزہ تحریر کا
زندگی کے شور سے گھبرا گیا جب بھی کبھی
رخ کیا میں نے اسی لمحے تری تصویر کا
ان دنوں بے چارگی گھیرے ہوئے ہے چارسو
لازماً یہ وقت ہے اب کچھ نئی تدبیر کا
ایک جیسی بات ہی کرتے ہیں یہاں ہیں لوگ سب
مسئلہ ہے اصل میں ب لفظ کی تاثیر کا
خالی نعروں اور جلسوں سے نہیں ہرگز نہیں
حل کبھی ہوگا نہیں یہ مسئلہ کشمیر کا
ہے یقیناً وہ فرشتے سے بھی افضل آدمی
کر رہا ہے کام جو کردار کی تعمیر کا

آنکھو سے بیاں پیار کے انداز تو دیکھو
کچھ اور نہیں دل کے سبھی راز تو دیکھو
ہر روز نئی سوچ نئی راہ ملے گی
اس زیست کے ہر لحظہ نئے ساز تو دیکھو
یوں ہی تو نہیں سب پہ ہوا آواز کا جادو
کیا خوب ہے وہ زمزمہ پرداز تو دیکھو
جس پر بھی پڑی لے اُڑی وہ ساتھ ہی اپنے
اس چشم حیادار کا پرواز تو دیکھو
ڈرنے کا نہیں فائدہ بس کام کرو کچھ
انجام خدا جانے تم آغاز تو دیکھو
جس ذات کو سب نبیوں کا سردار بنایا
اس ذات جہاں بان کا اعزاز تو دیکھو

شازیہ رُباب/کبیروالہ

قحط

اناج کے قحط پر بلکتے لوگو
کبھی سوچا ہے کہ یہ قحط
عارضی ہے، ٹل بھی سکتا ہے
اصل قحط تو ہے ''قحط محبت''
جو صدیوں سے طاری ہے اس سیارے پر
لوگ نام سنتے ہی دور بھاگتے ہیں
گھر کے دریچوں کو بند کر کے
گھٹن زدہ زندگی گزارتے ہیں
لیکن محبت نہیں کرتے
خامشی کی رگوں میں بے چینی
دھیرے دھیرے سلگتی رہتی ہے
اور اذیت کے ریگزار کبھی
اتار دیتے ہیں جاں سرابوں میں
بے نشاں راستے، سیاہ راتیں
بے بسی کا عجب خوف لئے
نیند سے کوسوں دور، رستوں پر
لوگوں کو تباہ کرتی ہیں
مگر لوگ محبت نہیں کرتے
ناراض آنکھوں میں چھپا اضطراب
وصل کی گھڑیوں کا خواب لئے
جسم کی مٹی میں گندھ سا جاتا ہے
پھر بے چینیاں خیمے لگاتی ہیں
ایک چہرہ ہنستا مسکراتا ہوا
نظر کے سامنے کبھی لہراتا ہے
آسماں سماج کی بے رحمی پر
چپکے چپکے آنسو بہاتا ہے
کسی کی مٹھی میں دبی کسی کی جاں
بھیگتے موسم میں دہائی دیتی ہے
سوکھے، ٹوٹتے زرد پتوں کی طرح
کسی کا جسم جدائی میں لرزتا ہے
مگر لوگ دستار کی بلندی پر
سب وار دیتے ہیں
سسک سسک کر مر جاتے ہیں
لیکن محبت نہیں کرتے
اناج کے قحط پر بلکتے لوگو
یہ جان لو کہ سب نظام حیات
اک محبت کے دم پہ چلتا ہے
تم محبت کو اب جگہ دے دو
ہو اناج کا قحط یا بھروسے کا
ہر قحط ٹل ہی جائے گا

سفر کے دائرے

یہ ساری کائنات
ایک دائرے کی کہانی ہے
جہاں لامحدود چھوٹے دائرے
قیدی ہیں ایک مرکز کے
کئی سلسلے ہیں، کئی کرشمے ہیں
جو ان دائروں میں سانس لیتے ہیں
ہر سلسلے کا اک تناسب ہے
جو کسی رسائی میں نہیں آتا
ہر دائرے میں کئی اسرار و رموز
جاگتے ہیں، کہیں سوئے رہتے ہیں
کئی آوازیں خلاؤں میں گونجتی ہیں
صدائے کن کئی تازہ جہاں تخلیق کرتی ہے
کئی زمانے مقید ہیں ایک دائرے میں
ہر دائرہ کئی کہانیاں لئے زندہ ہے
جاری ہے صدیوں سے
موت و حیات کا کھیل کہیں
لامحدود امکانات کا بوجھ لیئے
ہر دائرہ مرکز کے گرد گھومتا ہے
کہیں زعم یقیں ہے، کہیں لامتناہی فریب
کہیں دیوار حائل ہے، کہیں انکار کی منطق
کہیں بے نوا جسموں پہ گرتی بجلیاں
کہیں محبت میں ریاکاری و دھوکا ہے
کہیں موت کھیل ہے، زندگی ہے بوجھ
کہیں سسکتا ہوا آدمی جینے پہ ہے مجبور
کسی دائرے میں درندے بھی سانس لیتے ہیں
کہیں سانپ آستینوں کے موقع ملے تو ڈستے ہیں
کہیں نمرود و شداد ابھی بھی زندہ ہیں
کہیں نفرتیں پنپتی ہیں گلابوں میں
کہیں بے حیائی کمتی ہے شبابوں میں
کہیں ہجر کشیدہ بندے خود سے بیزار رہا کرتے ہیں
کسی دائرے کی اجنبی وسعتیں
کئی اضطراب لئے تھکن سے چور رہتی ہیں
کہیں سورج بھی روشنی نہیں دیتا
کہیں چاند بھی گرہن زدہ سا رہتا ہے
کہیں خوش رنگ الاؤ میں جلتے ہیں بدن
کہیں نا آسودگی کا، آگہی کا پیرہن
کہیں لفظوں کے مفہوم کا قصہ
کہیں بے معنی الفاظ کا دیباچہ ہے
کہیں انجان اندھیروں میں بلکتی روحیں
کہیں تاروں کی تمازت سے سلگتی سانسیں
کسی نام کے نقطے ہوئے غائب کہیں
کہیں اسلوب سے عاری بے معنی فقرے
ہر دائرے کی اپنی اک کہانی ہے
کہیں عیاں ہے اور کہیں انجانی ہے
یہ ساری کائنات اک دائرہ ہے

ہاچیکو - وفا کی علامت

عامر بن علی/ جاپان

انسان کی محبت میں جنگل کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے والے جانوروں میں کتا غالباً اولین ہے۔ کتے اور گھوڑے نے جنگل کو ایسا چھوڑا کہ پھر کبھی واپس نہیں پلٹے اور انسانی آبادیوں کو ہی اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ قرآن مجید میں اصحاب کہف کے واقعے سے ایک ثبوت یہ بھی ملتا ہے کہ کتا ہزاروں برس سے انسانوں کا پالتو جانور ہے۔ ہڑپہ، موہنجوداڑو سے ملنے والے آثار سے پتا چلتا ہے کہ وادی سندھ میں پانچ ہزار سال قبل یہ جانور جنگل چھوڑ کر انسانی بستیوں میں آباد ہو چکا تھا۔

خبر تو یہ ہے کہ گزشتہ روز جاپان کے مشہور زمانہ کتے ''ہاچیکو'' کا اپنے مالک سے اظہار محبت کرنے کا ایک انداز مجسمے کی صورت میں ڈھال کر ٹوکیو یونیورسٹی میں نصب کیا گیا ہے۔ اس مجسمے کی تقریب رونمائی کی تفاصیل سے پہلے یہ تعارف ضروری ہے کہ ''ہاچیکو'' کون تھا۔ اپنی موت کے اسی سال بعد بھی وہ اتنا اہم کیوں ہے؟ کہ اسکی برسی منانے کے لیے جاپان کی سب سے معتبر یونیورسٹی کے شعبہ زراعت میں اس مجسمے کو نصب کیا جارہا ہے۔ جو کہ اس کتے کا پہلا یا واحد مجسمہ نہیں ہے۔ کئی شہروں کے ریلوے اسٹیشنوں پر آپ کو ''ہاچیکو'' کا مجسمہ ایستادہ نظر آئے گا۔ فلموں کے شوقین حضرات اس کتے سے یقیناً متعارف ہوں گے، کیونکہ اس پر ہالی ووڈ کی ایک مقبول بلاک بسٹر فلم بھی بن چکی ہے، جس میں معروف آسکر ایوارڈ یافتہ اداکار رچرڈ گیر نے ہیرو کا کردار ادا کیا ہے، اس کتے کی زندگی پر بنائی گئی ''ہاچی'' نامی اس فلم میں بنیادی حقائق تو وہی ہیں مگر زیب داستان اور فلم کی ڈیمانڈ کے مطابق کچھ تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔

کتے کی اپنے مالک سے وفاداری کے اس تاریخی واقعے کا آغاز سن 1924ء میں ہوتا ہے، جب ٹوکیو یونیورسٹی کا پروفیسر اوانیو بھورے اور سفید رنگ کا ایک کتا خریدتا ہے۔ وہ اسے ہاچیکو کا نام دیتا ہے، جس کی عمر ایک برس کے لگ بھگ ہے۔ پروفیسر اوانیو جاپان میں جدید آبپاشی نظام اور دیہی ترقی کے شعبے کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے، جب وہ یونیورسٹی سے پڑھا کر واپس گھر لوٹتا تو قریبی لوکل ریل اسٹیشن پر اس کا یہ پالتو کتا اسے خوش آمدید کہنے کے لیے آنے لگا۔ پھر روزانہ کا معمول ہو گیا کہ جب پروفیسر یونیورسٹی سے فراغت کے بعد ٹرین پکڑ کر گھر کے قریبی شبیا اسٹیشن پر پہنچتا، تو اسٹیشن کے باہر ''ہاچیکو'' کو اپنا منتظر پاتا۔ پھر دونوں وہاں سے پیدل گھر تک کا سفر اکٹھے طے کرتے۔ یہ معمول ایک سال تک جاری رہتا ہے۔ پروفیسر کی سن 1925ء میں ناگہانی موت ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا پالتو کتا ''ہاچیکو'' اگلے 9 سال 9 مہینے اور پندرہ دن تک ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر اپنے مالک کا انتظار کرتا ہے، اور روزانہ بلاناغہ شام کو جب وہ ٹرین پہنچتی، جس پر اس کا مالک پروفیسر گھر لوٹتا تھا، ہاچیکو بے چین ہو جاتا۔ پہلے پہل تو لوگوں کا عمومی رویہ ''ہاچیکو'' کے ساتھ غیر دوستانہ تھا مگر آہستہ آہستہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ہاچیکو اپنے مرحوم مالک کا منتظر ہے۔ سن 1932ء میں کتوں کے بارے میں تحقیق کرنے والے ایک نوجوان محقق کا ''ہاچیکو'' کے بارے میں جاپان کے سب سے معتبر اور کثیر الاشاعت اخبار میں مضمون شائع ہوتا ہے، یہ نوجوان پہلے بھی ''ہاچیکو'' کی نسل کے بارے میں جسے ''اکیتہ'' کہا جاتا ہے۔ کئی مضامین لکھ چکا تھا۔ پھر ایک کے بعد ایک مضامین اخبارات میں ''ہاچیکو'' کے موضوع پر شائع ہونے لگے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی وفا کی علامت بن چکا تھا۔ جنگ عظیم دوم میں ''ہاچیکو'' کو شہنشاہ سے وفاداری کے ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

اپنے مالک کی آمد کا دس سالہ انتظار ہاچیکو کی موت کے دن 1935ء میں ختم ہوتا ہے۔ گیارہ سالہ زندگی پانے والے اس غیر معمولی وفادار کتے کو نیشنل میوزیم آف سائنس ٹوکیو میں حنوط کر کے رکھا گیا ہے۔ اس کی یاد میں ہر سال آٹھ اپریل کو سالانہ یادگاری تقریب کا اہتمام ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر کیا جاتا ہے۔ جس میں بلا مبالغہ سینکڑوں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ اسی اسٹیشن کے باہر پیتل کا ایک بہت بڑا مجسمہ ہاچیکو سے منسوب ہے دوسری جنگ عظیم میں ہاچیکو کے مجسمے کو نقصان پہنچا تو جس آرٹسٹ نے پہلا مجسمہ بنایا تھا اسی کے فرزند نے 1948 میں ہاچیکو کا نیا مجسمہ بنایا جو کہ اب تک اسٹیشن کے باہر ایستادہ ہے۔ اسٹیشن کے داخلی دروازے کا نام بھی اسی سے منسوب ہے ''ہاچیکو گیٹ''۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں گزشتہ روز ہاچیکو اور پروفیسر کے مجسمے کی تقریب رونمائی میں پانچ سو افراد نے شرکت کی۔ تقریب میں شریک ایک رضا کار کا کہنا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ یہ مجسمہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان گہری محبت کی ایک علامت بن جائے گا۔

کالم

دیکھتی آنکھیں سنتے کانوں

لبنیٰ صفدر/لاہور

90 کی دہائی بلا شبہ عروج کا زمانہ کہا جا سکتا ہے، فنونِ لطیفہ سے لے کر شعری مجموعوں غرض ہر شے پر عروج آیا۔ فلم، ڈرامہ، گانے غرض ہر شے نے جدت کی طرف اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے تھے لیکن ان سب کے بیچ میں ایک سادہ اور پُرکشش پروگرام نے پاکستانی عوام کے دلوں میں 1975ء سے گھر کیا ہوا تھا۔ ہم اور ہم سے پہلے والی نسل اور ہم سے بعد میں آنے والی نسل اکٹھی تین نسلیں اس خاص پروگرام کے سحر میں سالوں گرفتار رہیں بلکہ اب بھی بچپن کی حسین ترین یادوں میں اگر کوئی آخری یاد کے نشان نظر آتے تھے تو وہ اسی پروگرام میں نظر آتے تھے۔ یقیناً" آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نیلام گھر کی بات کر رہی ہوں جس کا نام بعد میں بدل کر بزمِ طارق عزیز اور طارق عزیز شو بھی رکھا گیا۔ یہ پروگرام اتنا مقبول ہوا کہ ہمارے گھر کے کام کاج کے ساتھ اسے دیکھنا ایک ضروری حصہ بن گیا اور اس پروگرام کی بے پناہ مقبولیت کی واحد وجہ بلا شبہ اس کے کمپیئر طارق عزیز تھے۔ طارق عزیز 1936 میں جالندھر میں پیدا ہوئے، 1947ء میں والدین کے ساتھ ہجرت کر کے ساہیوال میں آ کر مقیم ہو گئے۔ اُن کے والد اپنا نام عبدالعزیز پاکستانی لکھتے تھے۔ یہ پاکستان سے اُن کی بے پناہ محبت کا اظہار تھا۔ منفرد لب ولہجے اور شخصیت والے طارق عزیز نے نہایت مختصر عرصہ میں لوگوں کے درمیان اپنی الگ شناخت بنا لی، 1975 میں اُن کا مقبول ترین پروگرام نیلام گھر شروع ہوا۔ یہ اُن واحد پروگرامز میں سے ایک پروگرام بن گیا جس کو لاکھوں کروڑوں لوگوں نے پسند کیا، ہر گھر سے طارق عزیز کے پروگرام کی صدائیں گلی میں بھی گونجا کرتی تھیں۔ دیکھتی آنکھوں سنتے کانوں جیسے خوبصورت بول سے پروگرام کا آغاز کرنے والی آواز کی یاد آج بھی دلوں میں تازہ ہے۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے کے اختتام کے ساتھ ہر ناظر کے دل سے بھی پاکستان زندہ باد کے نعرے کی گونج سنائی دیتی۔ اتنی وارفتگی، اتنی محبت اور اتنے جوش وجذبے کے ساتھ یہ نعرہ بلند کیا جاتا تھا، نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کوئی ایسا کمپیئر پاکستان ٹیلی ویژن کو دستیاب ہوا اور نہ ہی اس جیسا پروگرام کوئی اور کر سکا۔ آج بے شمار ٹی وی چینلز اس کی نقل میں پروگرامز کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان پروگرامز میں وہ بات کہاں جس کو گھر کے تمام افراد مل بیٹھ کر دیکھا کرتے تھے۔ بیت بازی والا حصہ اتنا خوبصورت اور معیاری اشعار سے سجا ہوتا کہ تمام اشعار اپنی ڈائری میں تیزی سے نوٹ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ مجھے خوشی ہے کہ بزمِ طارق عزیز میں بارہا محسن عباسی کے اشعار سنائے گئے۔ دُنیا جانتی ہے کہ طارق عزیز صاحبِ اُسلوب اور سخن نواز شخصیت کے مالک تھے۔ لہٰذا پروگرام میں معیاری اشعار کا انتخاب اُس کی خوبصورتی رہا۔ سوال وجواب کا سلسلہ نہ صرف تجسس کو ہوا دیتا بلکہ عمدہ جنرل نالج میں اضافہ کا سبب بھی بنا کرتا، یہ خوش ذوقی یہ ادبی رنگ بھلا آج کے پروگرامز میں کہاں دکھائی دیتا ہے، طارق عزیز کے ساتھ کام کرنے والی باادب دوپٹہ اوڑھے خواتین بھی نہایت سلجھی ہوئی اور پڑھی لکھی ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے بعض نے بعد میں شہرت بھی پائی جن میں اِرم حسن اور ثمینہ پیرزادہ جیسی مقبول خواتین شامل ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ طارق عزیز شاعر بھی تھے، ہمزاد دا دکھ ان کا پنجابی شعری مجموعہ ہے، وہ منیر نیازی سے متاثر تھے۔

ہم وہ سیہ بخت ہیں طارق کہ شہر میں
کھولیں دکان کفن کی تو لوگ مرنا ہی چھوڑ دیں

اس شعر نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ پنجابی کے بہت سے اشعار بھی زبان زدِ عام ہوئے، طارق عزیز نے متعدد فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ لیکن چند ایک فلموں میں کام کرنے کے بعد فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی یہ شاید اُن کے ادبی مزاج سے میل نہ کھاتا تھا۔ طارق عزیز کی آواز کی گھن گرج آخری عمر تک برقرار رہی، بھاگ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنے کا منفرد انداز بھی آخر تک قائم رہا، لوگوں سے دلچسپ سوالات کا سلسلہ اور ہلکا پھلکا مزاح کا رنگ بھی اُسی طرح تروتازہ رہا۔ آخری عمر میں طارق عزیز نے ''فٹ پاتھ سے پارلیمنٹ تک'' اپنی خودنوشت بھی شائع کروائی۔ پشاری کی لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی اور اولاد نہ ہوئی۔ آخری عمر میں اپنی تمام جائیداد حکومتِ پاکستان کو دینے کی وصیت کر گئے۔ طارق عزیز ہمہ جہت شخصیت تھے۔ سیاست سے بھی وابستہ رہے، پہلے پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ رہے۔ جس کے جرم میں ضیاءالحق دور میں اُن کے پروگرام کو بند کر دیا گیا لیکن بیگم ضیاءالحق کی سفارش پر اُنہوں نے دوبارہ اپنا پروگرام شروع کروا لیا بعد میں طارق عزیز کی سیاسی وابستگی بھی تبدیل ہوگئی اور اُنہوں نے مسلم لیگ نواز میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1997ء میں وہ ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور 1999ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ 1992ء میں طارق عزیز کو تمغہ حسنِ کارکردگی بھی دیا گیا۔ بیاض کے ایک پروگرام میں شرکت کی جس میں طارق عزیز کی کمپیئرنگ رکھی گئی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے طارق عزیز کو نہایت قریب سے دیکھا اور سنا تھا اس کے بعد باوجود خواہش کے پروگرام میں شرکت نہ کر سکی۔ 2020ء کا سال بہت سے اہم لوگوں کو ہم سے جدا کر گیا۔ اللہ ایسی نابغہ روزگار ہستی کو غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ دیکھتی آنکھیں اور سنتے کان طارق عزیز کا سلام ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

شاعری

فقط لفظوں سے بہلانا ہے مجھ کو
تری ہر بات افسانہ ہے مجھ کو
گلی میں اجنبی بن کر کھڑا ہوں
یہاں ہر شخص بے گانہ ہے مجھ کو
کہیں جانا ہے جانا ہی پڑے گا
نہیں معلوم کب جانا ہے مجھ کو
کوئی مضمون کی صورت نہیں ہے
تبھی پر شعر فرمانا ہے مجھ کو
میں اپنی بات منواتا رہا ہوں
مرا کردار من مانا ہے مجھ کو
نگاہیں اس کی ایسی گم ہوئی تھیں
بڑی مشکل سے پہچانا ہے مجھ کو
میں دریائے غمِ دل میں رواں ہوں
بطورِ موج لہرانا ہے مجھ کو
جوانی کی گھڑی مشکل ہے ثاقبؔ
بھرا گھر بار ویرانہ ہے مجھ کو

آصف ثاقب/ بوئی ہزارہ

بھلا منت سماجت سے کسی کا کام ہوتا ہے؟
جو دکھ بیتی سنائے، مفت میں بدنام ہوتا ہے
چھپا ہوتا ہے پس منظر کوئی، ہر پیش منظر میں
ہوں جب خاموش لب، دل میں بپا کہرام ہوتا ہے
وصال آزار بن جائے تو یہ عشاق سے کہہ دو
جدائی بھی خدائے پاک کا انعام ہوتا ہے
فراعین جدید اب حملہ آور جب بھی ہوتے ہیں
ہمیشہ ان کے لب پر، امن کا پیغام ہوتا ہے
وہاں کیا ہاتھ ڈالے کوئی، مجرم کے گریباں میں
جہاں خود مدعی ہو موردِ الزام ہوتا ہے
کبھی بھولو نہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان کا مطلب
بقا آغاز ہو جو بھی، فنا انجام ہوتا ہے
سکوں کی جستجو میں بے سکوں ہو کر سمجھ آیا
سکوں کو ڈھونڈنا بھی اک خیالِ خام ہوتا ہے
ذرا کر صبر غم کی رات بھی ڈھلنے ہی والی ہے
پریشاں کس لیے تو اے دلِ ناکام ہوتا ہے
سخنور! اپنی سوچیں تول میزانِ حقیقت میں
انہیں اوہام کہتے ہیں کہ یہ الہام ہوتا ہے
پریشاں عمر بھر رہتا ہے مومن قیدِ دنیا میں
لحد میں ہی اُسے جا کر نصیب آرام ہوتا ہے
جو اوروں کو دیا تھا غم وہی اب سہہ رہے ہیں ہم
یہی انجام ہونا تھا، یہی انجام ہوتا ہے
جلالؔ انسانیت کی روح سے انجان، کیا جانیں
کسے کہتے ہیں دیں، کیا مذہب اسلام ہوتا ہے

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال/ بہاولپور

ہر طرف خاموشیوں کا شور ہے
بڑھتا سناٹا بڑا منہ زور ہے
ہے وبا کیسی نہیں جس کا علاج
جو بلا اُتری ہے آدم خور ہے
پھر نیا الزام مجھ پر آئے گا
پھر اشارہ اس کا میری اور ہے
اب کسے رہبر بنائیں دوستو
ہے کوئی ڈاکو تو کوئی چور ہے
پھر سے یادوں کی جھڑی لگنے کو ہے
پھر سے یادوں کی گھٹا گھنگھور ہے
توڑتے ہو دل پہ کیوں غم کے پہاڑ
جانِ جاں یہ دل بڑا کمزور ہے
کوئی تو روکے جلیلؔ اس کے ستم
کس قدر ظالم یہ قاتل ڈور ہے

احمد جلیل/ اوکاڑہ

مرے یقین کو رستہ نیا دکھائیں گے
یہ حادثے ہی مرا حوصلہ بڑھائیں گے
کہانیوں میں سنا تھا وبا کے بارے میں
خبر نہیں تھی کبھی ہم بھی زد میں آئیں گے
ابھی ملول سے چہرے، اُداس آنکھیں ہیں
مگر یقین ہے، سب پھر سے مسکرائیں گے
یہ اور بات اُڑانوں کو بھول بیٹھے ہیں
یہی پرند فضا میں دوبارہ آئیں گے
ابھی تو گھر کے اندھیروں میں چھپ کے بیٹھے ہیں
کبھی یہ شہر کے بچے دیے جلائیں گے
وہاں سے ہم نے اُجالے کشید کرنے ہیں
ہم اپنے باغ سے تتلی پکڑ کے لائیں گے

محمد نوید مرزا/ لاہور

بظاہر تو چمن زاروں میں رہتا ہوں
حقیقت میں مگر غاروں میں رہتا ہوں
جو سوچوں اپنے بارے میں تو کیا سوچوں؟
میں دلداروں، میں غم خواروں میں رہتا ہوں

مجھے بچوں کی آہیں خوں رُلاتی ہیں
میں دکھیاروں، میں ناداروں میں رہتا ہوں
حوالے غیر کے کیسے کروں تجھ کو
میں تیرے دوستوں یاروں میں رہتا ہوں
اکیلے پن میں خوشیوں کے بھی ساماں ہیں
میں تنہا ہو کے بھی ساروں میں رہتا ہوں
مرے اندر کا انساں بول سکتا ہے
مگر میں چپ ہوں، درباروں میں رہتا ہوں
تم اپنے پاس رکھو روشنی اپنی
میں اپنے گھر کے اندھیاروں میں رہتا ہوں
میں کیسے قد نکالوں گا یہاں بسمل
کہ میں رسموں کی دیواروں میں رہتا ہوں

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

یارو اتنا خیال رکھنا
آب گینے سنبھال رکھنا
نسلِ نو کے لیے جہاں میں
رونقیں تم بحال رکھنا
روشنی کے لیے ہمیشہ
چند جگنو بھی پال رکھنا
دل میں اپنے عدو کی خاطر
شیشے میں تم نہ بال رکھنا
خواہشیں دل فریب چنگل
خود کو ان سے نکال رکھنا

نازاوکاڑوی/لاہور

جوانی کا یہ آہو مرغزاروں سے نکل جائے
ہوا کا کیا بھروسہ کب غباروں سے نکل جائے
ارادہ آسماں کی سیر کا اب چھوڑیے صاحب
کہیں دھرتی کا منظر ہی نظاروں سے نکل جائے
نظارہ جوشِ دریا کا تمھیں مسحور کرتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو پانی کناروں سے نکل جائے
ہماری گل زمیں کی التجا ہے زرد موسم سے
اُٹھا کر پھول کا صدقہ بہاروں سے نکل جائے
جہاں میں یہ صدی باتش یہی پیغام لائی ہے
سنو تہذیب آدم اب تو غاروں سے نکل جائے

ڈاکٹر جاوید باتش/لاہور

نظر رکھتے کہیں پر ہیں، نظارا اور ہوتا ہے
زباں کچھ اور کہتی ہے، اشارا اور ہوتا ہے
کئی روشن ستاروں کی مثالیں یاد ہیں اُس کو
اُسے کہہ دو کہ قسمت کا ستارا اور ہوتا ہے
کتب بینی سے ملتا ہے سبق انسان سازی کا
کہ مکتب اور ہوتا ہے ادارا اور ہوتا ہے
کسی کے ساتھ چلنے سے عذابِ جاں نہیں ٹلتا
ضرورت اور ہوتی ہے سہارا اور ہوتا ہے
ہے وابستہ اُسی سے اس دل اُمید کی دھڑکن
جو ترکِ عشق کرتے ہیں، خسارا اور ہوتا ہے

عرفانہ امر/گوجرانوالہ

ہر اک لمحہ یہاں بارِ گراں ہے
یہ دنیا ہے یہاں کس کو اماں ہے
نگر آباد تھا کل جس جگہ پر
وہاں پر آج حسرت ہے فغاں ہے
کریں دعویٰ تو کس پر ملکیت کا
زمیں اپنی نہ اپنا آسماں ہے
بنا ہوں اور ہستی سے مٹوں گا
مری اتنی سی لوگو داستاں ہے
ہر اک لہجے میں وحشت بولتی ہے
ہر اک چہرا دکھوں کا ترجماں ہے
دھڑکتا تھا جو سینے میں ہمارے
وہ بچھڑا یوں کہ گم سم آسماں ہے
میں روگی ہوں، میں جوگی ہوں تو شاہد
مری قسمت میں گردِ کارواں ہے

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

خوشبو ترے وجود کی آتی ہے رات بھر
سونے لگوں تو یاد ستاتی ہے رات بھر
بہکی ہوئی ہوا کی یہ شوخی تو دیکھیے
آہٹ وجودِ یار کی لائی ہے رات بھر
گاؤں سے اُس طرف کے مکانوں میں بیٹھ کر
کوئی سہاگ گیت سے گاتی ہے رات بھر
خود جاگتی ہے ماں مگر لختِ جگر کو وہ
لوری محبتوں کی سولاتی ہے رات بھر
گزرے دنوں کی یاد کو دل میں سمیٹ کر
کوئی وفا کے دیپ جلائی ہے رات بھر
جب سے ہوا ہوں قریۂ جاں ہیں اداس میں
خوشبو ترے بدن کی بولاتی ہے رات بھر
کیوں وہ لپٹ گئی دمِ رخصت خیال سے
کیوں یاد بات بات پہ آتی ہے رات بھر

قاسم خیال

تکتی کیا ہو مجھ کو یوں حیرانی سے
ہاتھ نہ آؤں گا اتنی آسانی سے
تنکا تنکا میں نے تم کو جوڑا ہے
بکھر نہ جانا چھوٹی سی نادانی سے

مدِ مقابل جب بھی شیشہ آتا ہے
ڈر جاتا ہوں آنکھوں کی ویرانی سے
گھر کے اندر چور چھپے بیٹھے ہوں تو
بولو حاصل کیا ہو گا نگرانی سے
پھر سے میرے گاؤں کو کھا جائے گا
ڈر لگتا ہے دریا کی طغیانی سے
پانی دیکھ کے پانی پانی ہوتا ہوں
اب تو خون کی بو آتی ہے پانی سے
دل کی دنیا اجڑ گئی تو کیا قاسم
گھر والے تو خوش ہیں نقل مکانی سے

قاسم خیال /سرگودھا

لگتا ہے مجھے وہ کہ پریشان بہت ہے
سیلاب کے آنے کا بھی امکان بہت ہے
اندر سے عمارت وہ نکل آئی ہے خالی
باہر سے تو لگتا تھا کہ سامان بہت ہے
میں دنگ ہوا جاتا ہوں اب دیکھ کے اُس کو
اور وہ بھی مجھے دیکھ کے حیران بہت ہے
جس کام میں ہوتا ہے بہت نفع یہاں پر
یہ سوچ لو اُس کام میں نقصان بہت ہے
کچھ کر کے دکھانا بڑا مشکل ہے مرے دوست
کر دینا یونہی بات تو آسان بہت ہے
ہر شخص سے کھاتا ہے نیا دھوکہ ہمیشہ
یہ دل ہے کہ بچپن سے ہی نادان بہت ہے
گمنام یہاں دیکھا ہے طاہر کو وگرنہ
اس شہر میں ہر شخص کی پہچان بہت ہے

طاہر عدیل/ڈنمارک

جو نئے گلشنوں کی طرف اُڑ گیا تھا ضرور آئے گا
اے اکیلے شجرِ غم نہ کر وہ پرندہ ضرور آئے گا
رائیگانی کی آندھی ہمارے دیوں کو بجھاتی رہی
اور ہم اس گماں میں رہے وقت اچھا ضرور آئے گا
خواب کی کیاریاں سوکھتی جا رہی ہیں مگر ایک دن
آنکھ میں ٹھہرے چشمے رواں کرنے والا ضرور آئے گا
قافلہ ہے رواں خوشبوؤں کے نگر کی طرف دیر سے
راستے میں کہیں تیرے باغوں کا رستا ضرور آئے گا
ہم بالآخر محبت کو دریافت کرنے نکل آئے ہیں
دیکھنا اپنے ہاتھ اس خزانے کا نقشہ ضرور آئے گا

عبیداللہ نزاکت/حاصل پور

وہ چاند چہرہ ستارا آنچل
وہ رشکِ گل پیارا پیارا آنچل
سمیٹ رکھا ہے حُسن سارا
لپیٹ رکھا ہے سارا آنچل
فضا تو رنگوں سے بھر گئی پھر
کہیں اُڑا جب تمہارا آنچل
عیاں ہوئے حسن کے خزانے
کبھی جو اُس نے اُتارا آنچل
فرشتے حیرت سے دیکھتے ہیں
لحد پہ میری تمہارا آنچل

خالد مسعود/لاہور

ہر راز کھولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
میں سچ جو بولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
اچھے بھلے شریفوں کے ظاہر کو چھوڑ کر
اندر کو پھولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
حرکت تو دیکھو میری کہ حد یزید میں
انصاف تولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
اخلاقیات کا میں جنازہ نکال کر
لہجے ٹٹولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
کس کی مجال ہے کہ کہے مجھ کو بدتمیز
میں خود ہی بولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
کر کے غمِ حیات کی تلخی کا میں نشہ
دن رات ڈولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں
باقر ہر ایک شعر میں حق سچ کی شکل میں
میں زہر گھولتا ہوں بڑا بدتمیز ہوں

مرید باقر انصاری/میانوالی

رونقیں ہیں بڑی اجنبی شہر میں
اک ہے تیری کمی اجنبی شہر میں
بے بہا حُسن ہے پھر بھی جانِ غزل
کب ہے تجھ سا کوئی اجنبی شہر میں
تیرے ہونے کا احساس ہے جا بجا
کتنی ہے دل کشی اجنبی شہر میں
تیری یادوں کی کھلتی گئیں چھتریاں
جب بھی بارش ہوئی اجنبی شہر میں
کچھ پرندوں، درختوں، عمارات سے
ہو گئی دوستی اجنبی شہر میں
اجنبی شہر بھی اجنبی ہی رہا
ہم تو تھے اجنبی، اجنبی شہر میں
جب بھی سوچا تجھے آ گئی خود بخود
میرے لب پر ہنسی اجنبی شہر میں
مجھ کو تیرے سوا کچھ بھی دکھتا نہیں
اتنی ہے روشنی اجنبی شہر میں

چار دن تیرے بن ایسے گزرے لگا
کٹ گئی زندگی اجنبی شہر میں

حسن عباسی/لاہور

کیا مقدر میں بھی لکھا ہوا ہے
جو مری زندگی بنا ہوا ہے
میں کسی لمحے میں پڑی ہوئی ہوں
وہ کسی عہد میں رُکا ہوا ہے
پاؤں باہر دھرا تو کیا ہوگا
خواب دہلیز پر رکھا ہوا ہے
اک اکیلا جو ساتھ تھا میرے
اب وہی دوسرا بنا ہوا ہے
باغ سے یہ ہوا تو لائی نہیں
پھول کھڑکی میں جو رکھا ہوا ہے
جسم آدھا ہے میرا دنیا میں
آدھا دیوار میں چُنا ہوا ہے

لبنیٰ صفدر/لاہور

اسباب یہی ہے یہی سامان ہمارا
چڑیوں سے مہکتا رہے دالان ہمارا
ہر شخص کو خوشحالی کی دیتے ہیں دُعائیں
ہر شخص ہی کر جاتا ہے نقصان ہمارا
ہر شخص ہی کیوں اس کو مٹانے پہ تلا ہے
دیواروں پہ لکھا ہوا پیمان ہمارا
پیتے ہیں فقط ساتھ نبھانے کے لیے ہم
ہر شام کو غم ہوتا ہے مہمان ہمارا
رہنا ہے کسی اور کے قبضے میں ہمیشہ
بھر سکتا نہیں کوئی بھی تاوان ہمارا
اس بات کا دُکھ ہے کہ اشارہ نہیں کاٹا
ہر موڑ پہ ہوتا رہا چالان ہمارا
ہر روز پڑے ہوتے ہیں سب پھول زمیں پر
یہ کون گرا دیتا ہے گلدان ہمارا

محمد اقبال پیام شجاع آبادی/لاہور

بہار کے دنوں میں اُجاڑ موسم (کورونا)

اب کے کیسی بہار آئی ہے
جھاڑیاں بن گئے ہیں پھول سبھی
اور مہک بھی نہیں ہے پھولوں میں
اک اُداسی ہے سارے چہروں پر
کس طرح کا آ گیا موسم
اب کے کیسی بہار آئی ہے
کچھ چہک بھی نہیں پرندوں کی
اور سنسان سارے رستے ہیں
شہر خاموش ہوگئے جیسے
اتنے تنہا تو ہم کبھی نہ تھے
اک اُداسی ہی گیت گاتی ہے
ایسے قصے تو پہلے سنتے تھے
شہر کے شہریوں ہی مٹتے تھے
انہی قصوں کی ایک سرگوشی
آج بھی تو سنائی دیتی ہے
زرد بادل بھی چھٹ ہی جائیں گے
جو دریچوں میں ہیں رکھے یہ چراغ
ایک دن پھر سے جل ہی جائیں گے
وہی موسم پلٹ کے آئیں گے
میرے اللہ رحم کر ہم پر
ہر خوشی پھر سے لوٹ کر آئے
زندگی پھر سے لوٹ کر آئے

شہناز نقوی

عینی شاہد

میرے ہر حال کے
میرے ماہ و سال کے
عینی شاہد بھی تھے
اور میں بے ساختہ انسان تھا
نہ کسی سے جنگ تھی نہ کوئی عنوان تھا
اور وہ سبھی برگزیدہ زاہد بھی تھے
اپنے اپنے طور پر وہ برسرِ پیکار تھے
ہر لمحے میں معرکوں کے وہ جید بھی تھے
مجاہد بھی تھے
میں کسی بھی طور پر نہ کہیں مقروض تھا
لیکن دست بستہ عرض تھا
سر بسجود معروض تھا
کیوں میرے شاہد ہو تم
میں کہاں آزاد ہوں
تنہا مجھ کو چھوڑ دو
میں فقط آدم زاد ہوں
میرے سجدے کھینچ لیں گے ایک حد کسی زنجیر سے
گر میں اس کو راضی کر لوں اپنے مافی الضمیر سے
تو کیا لینا ہے مجھے پھر کسی
منکر ونکیر سے
یہاں بچوں کی خاطر ہیں بارودی گلیاں
یہاں قبروں کے نیچے جھلسی ہوئی کلیاں
ان کو بھی دیکھو سر کو ہلاتے ہوئے
اپنے ہاتھوں سے سولی بناتے ہوئے
ان کو جنازے اُٹھاتے ہوئے
ان کو یہاں کبھی آنے تو دو
ان کو بھی ماضی میں جانے تو دو

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

بقیہ انٹرویو راجا نیئر

شاعر، مصور، کالم نگار اور براڈ کاسٹر راجا نیئر سے ارژنگ کے چیف ایڈیٹر کا خصوصی مکالمہ

س۔سب سے پہلے اپنے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے؟

ج۔عامر بھائی یہ میری خوش بختی ہے کہ میں ایک ترقی پسند، شاعر، دانشور، انسان دوست ہستی لطیف ادیب کے گھر پیدا ہوا۔ میرے دادا جان چراغ الدین محمد دائم (قانونگو، زمیندار) اردو، پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور مصوری و موسیقی سے بھی انھیں گہرا شغف تھا۔ افسوس کہ وہ 1935 کے قریب ٹی بی کے باعث انتقال کر گئے۔ والد گرامی جناب لطیف ادیب استاد شاعر مانے جاتے تھے۔ انہیں بھی مصوری و موسیقی سے لگاؤ تھا۔۔۔ چونکہ لکھنا پڑھنا میری سرشت میں شامل تھا، اور شائد اسی لیے فنون لطیفہ سے بھی میں فطری طور پر وابستہ ہوگیا۔ کچھ ہمارے شہر پاک پتن کی ادبی و روحانی فضا کے زیر اثر میں بھی کسی خاص لمحۂ عنایت و کرم میں فیض یاب ہوگیا ایسی ہی کسی ساعت میں والدین کی دعاؤں کے نتیجے میں مجھ پر خاص کرم ہوا اور مالک نے مجھے شعور شاعری بخش دیا۔ تب میں اپنے سینیئرز کے زیر سرپرستی اوائل عمری ہی سے ادبی خدمات انجام دینے لگا۔80ء کی دہائی میں اوکاڑہ، بورے والا اور ساہیوال کے ادبی حلقوں میں بھرپور شرکت کی۔ اس وقت کے متحرک دوستوں میں قمر رضا شہزاد، جمیل احمد عدیل، کاشف سجاد، مسعود اوکاڑوی، رشید تبسم، سرور جاوی، علی رضا میرے ذاتی دوست ہیں۔ ان سے اَن گنت خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ اُس وقت اپنے چند دوستوں کو دادا جان کے اشعار سُنایا کرتا تھا۔ ایک بار یہ شعر سُنایا تو چند ہی دنوں کے بعد خیال جوں کا توں سرقہ کرلیا گیا۔ شعر یہ تھا:

دو دلوں کا معاملہ ہے عشق
بیچ میں کیوں سماج آصے ہے

اب والد گرامی لطیف ادیب کا ایک نعتیہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

ان کی غار حرا کی تنہائی
ساری انسانیت کے کام آئے

ہمارے شہر کی ادبی و روحانی فضا اور کلچرل تناظر نے بھی میرے تخلیقی شعور کو خوب نکھارا، میری مصوری سے گہری وابستگی اور آرٹ فوٹو گرافی کی تشہیر نے مجھے لاہور سے وابستہ کیا، اور 85ء میں ڈاکٹر طارق عزیز نے روزنامہ مشرق میں میرا انٹرویو کیا، 88ء میں سعید آسی نے نوائے وقت میں متعارف کرایا اور سب سے اہم اس وقت ماہ نو کے ایڈیٹر معروف شاعر قائم نقوی نے میرے کئی ٹائٹل ماہ نو میں شائع کر کے وسیع پزیرائی سے نوازا۔ 89ء سے مستقل لاہور میں ہوں۔ یہاں کے ابتدائی دوستوں میں فرحت عباس شاہ، اختر شمار، منصور آفاق، اطہر ناسک، زاہد ھما، علی نواز شاہ، لطیف ساحل، عمران نقوی، فیصل حنیف، اور آفتاب اقبال (سینئر پروڈیوسر ریڈیو پاکستان) میرے لیے نہایت اہم ہیں۔ بعد میں جن دوستوں سے کھلی دوستی کا اٹوٹ ناتا بندھا ان میں عامر بن علی سرفہرست ہے۔

س۔اپنی تصانیف کے بارے میں بتائیں؟

ج۔عامر بھائی لاہور میں میڈیا سے وابستگی، ریڈیو پاکستان کے لیے فیچر لکھے، ڈرامے لکھے، ادبی پروگرام طویل عرصہ تک کیے۔۔۔ یہ سفر ابھی تک جاری ہے. اپنا ٹی وی چینل پر اداکار بابر علی کے مارننگ شو میں ان گنت ادبی پروگرام کئے۔ 1996ء میں اردو شاعری کا مجموعہ شائع ہوا تاہم پبلشرز کی سخت شرائط کے باعث دو تین کتابوں کے مسودے شائع نہیں کروا سکا۔ آپ دیگر ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہیں۔ امید ہے کہ اس سال ایک مجموعہ کلام شائع کرسکوں گا۔

س۔آپ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔۔۔ شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

ج۔عامر بھائی میں اول و آخر شاعر ہوں۔۔۔ باقی فنون سے وابستگی شوقیہ ہے، البتہ مصوری مجھے شاعری ہی کی ترجمان محسوس ہوتی ہے۔ جہاں تک کالم نگاری، فیچر نگاری یا ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے وہ موضوع کی مناسبت سے خود بخود اپنا الگ امیج بنانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کو بھی اس کا اندازہ تو ہوگا۔

س۔الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

ج۔کسی حد تک کہ سکتے ہیں در اصل اردو اور دیگر مادری زبانوں سے دوری اس صدمے کی اصل وجہ ہے۔ انگلش میڈیم اسکول سسٹم نے بھی ہمارے ہاں کتاب سے دوری پیدا کی ہے۔ آئندہ نسل اپنی رابطے کی زبان اور مادری زبان سے یکسر کٹتی دکھائی دے رہی ہے۔ جبکہ یورپ، امریکہ وغیرہ میں کتاب پڑھنے کا رجحان آج بھی برقرار ہے۔ یہ ہمارا ہی فرض ہے کہ اپنی اگلی نسل کو مقامی زبانوں سے مکمل آگاہی دیں اور انھیں کتاب کی اہمیت سے بھی آگاہ کریں۔

س. تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج۔عمدہ خیال کو عالم غیب سے وجود میں لانے کو تخلیقیت سمجھتا ہوں، لیکن اس کا منفرد ہونا، اور دوسرے انسان کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دینا، اچھے اور عمدہ تخلیق کار کا کام ہے۔

س۔کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج۔گزرے ہوئے وقت کی خوشگوار یادیں اور انہیں کی دھیمی دھیمی آنچ سے ابھرتے اچھوتے اور دلکش خیال کی مہک، لمحاتی اور دائمی سطح پر آسودگی بخشتی ہے اور وہی سچے تخلیق کار کی زندگی ہے۔

س. مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا

ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج. ہمارے ہاں مشاعروں پر زوال منافقت اور گروپ بندی کے باعث آیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جو جس ادارے سے وابستہ ہے اپنے اختیارات کا خوب استعمال کرتا اور وقتی طور پر تعلقات بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر جب وہ عہدہ چھوٹ جاتا ہے تو سارے عوامل کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جینوئن تخلیق کار کا راستہ روکنے سے قدرت کاملہ عروج کیوں کر عطا کر سکتی ہے۔۔۔ ایسی صورت حال سے کسی طور بھی مطمئن نہیں ہوا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں یا بیرون ممالک میں سامعین بار بار چند لوگوں کو کب تک سنتے رہیں؟ نئے لوگوں کو بھی مقامی و بیرونی مشاعروں میں بلانا چاہیے۔

سوال: شہرت کے حوالے سے کیا کہیں گے؟

جواب: شہرت اور بھرپور تعارف فقط قسمت کا کھیل ہے۔ قادر مطلق جسے چاہے دوام عطا فرمادے۔ تاریخ ادب میں اَن گنت ایسے تخلیق کاروں کا نام سامنے آتا ہے جنہیں اُن کی زندگی میں اعلیٰ پائے کی شاعری تخلیق کرنے کے باوجود اس سطح کی شہرت نصیب نہیں ہوتی۔ بسا اوقات معروضی حالات کے باعث ''انجان'' اور اجنبی رہنا بھی عزت کا باعث بنتا ہے۔

اسی حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

انجان سے پھرتے ہیں
کس شان سے پھرتے ہیں
جب سے تمہیں دیکھا ہے
حیران سے پھرتے ہیں
اک ہجر سا لاحق ہے
بے جان سے پھرتے ہیں
ہم وہ نہیں صاحب جو !
ایمان سے پھرتے ہیں

وہ کہتے ہیں ناں...... ''فکر ہر کس بقدر ہمت اوست''

س. کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے یا اندرون سے؟

ج. ہر جینوئن تخلیق کار اپنے معاشرے بلکہ پوری دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے، تخلیق کے لمحات میں اس کا باطن اور تحت الشعور میں مجتمع واقعات، سانحات اور نامکمل آرزوئیں اس کی تازہ تخلیق کو تکمیل سے آشنا کرتی ہیں...... اسی عمل سے تخلیق کار کا اہر و باطن معطر ہوتا رہتا ہے۔

س. آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج. جہاں تک ادب آشنائی کا تعلق ہے اسے تو سوشل میڈیا نے خوب سہارا دیا ہے البتہ جو سوشل میڈیا نے متشاعر جنمے ہیں اس سے ادب کا مستقبل گہنایا جا رہا ہے... بے وزن، بے ہنگم ڈھکوسلوں کو چند لمحوں میں واہ واہ کا ایندھن بہم پہنچانے والے دادیوں کی وافر مقدار ہر گھڑی سوشل میڈیا پر ٹکراتی رہتی ہے۔ سو ادب کا بھی اللہ ہی مالک ہے سر۔ مزید اس حوالے سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک ہم نئی نسل کو اُن کی زبان پڑھنے اور سمجھنے کے قابل نہیں کریں گے اُس وقت تک محض متشاعر ہی پیدا ہوں گے، اچھے تخلیق کار سوشل میڈیا پر کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لحاتی داد مستقل مقام عطا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

س. کیا کھویا کیا پایا؟

ج. الحمدللہ میں نے شاعری، مصوری، کالم نگاری اور براڈ کاسٹنگ سے بہت محبتیں سمیٹیں، بہت پیار کرنے والوں کا مقروض ہوں، جب کوئی شخص آپ کا شعر سننے کے بعد بار بار آپ کی حوصلہ افزائی کرے، پینٹنگ دیکھ کر سراہے، آپ کے کالم کو پڑھ کر دوسروں کو پڑھنے کی دعوت دے، آپ کی گفتگو سن کر ریڈیو پر کال کر کے سراہے اور آپ سے کئی اَن دیکھے لوگ محبت سے بار بار ملنے کا تقاضا کریں تو اس میں دور دور تک کوئی بھی خسارہ دکھائی نہیں دیتا۔

آخر میں آپ کی محبت کا شکریہ۔ اس خوبصورت ملاقات پر آپ کا ممنون ہوں۔ اللہ پاک ارژنگ کو اور آپ کے سب ساتھیوں کو مزید عزت سے نوازے۔

عامر بن علی/ جاپان

نفرتیں تو بڑھ گئی ہیں دوستی ملتی نہیں
اس نگر میں اب سُنا ہے عاشقی ملتی نہیں
میں نے دنیا بھر کی ہر اک کامیابی دیکھ لی
تجھ سے مل کر جو ملی تھی وہ خوشی ملتی نہیں
چھان کر صحرا جو دیکھا تب کہیں مجھ پر کھلا
ریت میں کھوئی کوئی شے قیمتی ملتی نہیں
اس کے چہرے کی دمک سے شہر میں تھی روشنی
اس قدر جو مہرباں ہو چاندنی ملتی نہیں
اور بھی دنیا میں کتنے خوبصورت لوگ ہیں
ہاں مگر جو اس میں ہے جادوگری ملتی نہیں
زرد پتے گر رہے ہیں جو خزاں کے خوف سے
پیڑ سے جو کٹ گرے تو زندگی ملتی نہیں
اس کی آنکھوں نے کہی جو بات مجھ کو یاد ہے
کاغذوں پہ جان ایسی شاعری ملتی نہیں

ہم بھلا نہیں پائے

تیرے پیار میں جاناں
کس طرح گزارے تھے
زندگی کے روز و شب
اور جب سے آیا
زندگی کی راہوں پر
راستے بدلنے کا
تم سے جاں بچھڑنے کا
دل پہ کیا عذاب آئے
زندگی کے وہ لمحے
ہم بھلا نہیں پائے

بقیہ انٹرویو ممتاز راشد لاہوری

سوال: اپنے بچپن اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میرے والد میاں محمد شفیع کے بچپن میں ان کی والدہ فوت ہوگئی تھیں۔سوتیلی والدہ کے ناروا سلوک کی وجہ سے وہ تین چار جماعتیں ہی پڑھ سکے اور عملی زندگی میں پڑ گئے۔والدہ کی طرف سے انھیں اپنے آبائی موضع محمود بوٹی لاہور کی نورانی سٹریٹ نمبر 11 کے مکان نمبر 14 کی وراثت ملی تھی۔ان کی شادی کوچہ غلام دستگیر (گلی نمبر 130) چراغدین روڈ مزنگ لاہور کی صغریٰ بی بی (میری والدہ) سے 1951 میں ہوئی۔پہلا بیٹا چار ماہ کی عمر میں فوت ہوگیا۔دوسرا بیٹا مَیں تھا۔میری پیدائش 25 نومبر 1953 کو ننہال میں ہوئی۔بچپن،لڑکپن اور جوانی محمود بوٹی والے گھر میں گزاری۔یہ بستی اب لاہور رنگ روڈ کے ''محمود بوٹی انٹر چینج'' کے پاس ہے۔پہلے یہاں سے دریائے راوی کے پُل تک جانے والی سڑک ''بند روڈ'' روڈ کہلاتی تھی کیونکہ راوی کے سیلاب سے لاہور کو بچانے کے لیے یہاں سڑک کے ساتھ ساتھ طویل بند بنا ہوا تھا۔پرائمری سکول تک میری تعلیم چوک محمود بوٹی کے قدیمی ایم سی پرائمری سکول میں ہوئی۔میٹرک مَیں نے 1969ء میں شالامار باغ لاہور سے متصل قدیمی گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ سے کیا تھا۔پھر پاک جرمن ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر TTC مغلپورہ لاہور سے مکینیکل ڈرافسمین کا دو سالہ کورس کیا۔گورمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی (ریلوے روڈ لاہور) سے سول ڈرافسمین کا ایک سالہ کورس بھی کیا۔تب اس کالج کا نام گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ تھا۔ویسے اس دوران میں کچھ ماہ ننہال میں بھی رہا اور کوئی چار سال اپنی بڑی خالہ کے ہاں محمدی سٹریٹ پیر غازی روڈ اچھرہ میں بھی۔ٹی ٹی سی کورس کے بعد دو سال بے روزگاری میں کٹے تھے۔اس دوران مطالعہ کتب ،سائکیل پر لاہور گردی وغیرہ کا شوق رہا نیز اپنے ہاتھ سے پورا قرآن پاک لکھا۔1973ء میں اورینٹ میچ کمپنی (ماچس فیکٹری) شاہدرہ میں ڈرافسمین کی ملازمت مل گئی۔

سوال: تعلیم اور روزگار سے متعلق ''ارژنگ'' کے قارئین کو کچھ آگاہ کیجیے؟

جواب: تعلیم کے بارے کچھ تفصیل پچھلے جواب میں ہے،مزید یہ کہ روزگار کے سلسلے میں نومبر 1977ء کو لاہور سے قطر گیا تو مطالعہ کتب کا پرانا شوق خوب پروان چڑھا مگر روایتی تعلیم میٹرک تک ہی تھی۔پھر وہیں قطر میں تیاری کر کے بارھویں کا امتحان پاس کیا اور عربی زبان کا کورس شروع کیا۔قطر کے سرکاری ادارے ''معهد اللغات'' (لینگویج انسٹی ٹیوٹ) میں عربی زبان کا یہ چار سالہ کورس میرے اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں وسعت کا سبب بھی بنا۔اس کی سند قطر کے وزیرِ تعلیم کے دستخط کے ساتھ ملی تھی۔ساتھ ہی میں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کا بی اے (زبان و ادب گروپ) کا فاصلاتی نظام تعلیم والا مرحلہ شروع کر دیا اور چھ چھ ماہ کے چار سمسٹروں کے امتحانات وغیرہ دیے اور کوئی ڈھائی سال بعد بی اے کی سند بھی مل گئی۔اس کورس میں میرے مضامین میں اردو،عربی،اقبالیات،اسلامیات،پاکستان کے صوبوں کا ادب اور غیر ملکی ادب وغیرہ تھے اور یوں علمی و ادبی آگاہی میں خاصی وسعت آئی۔ساتھ ساتھ نئی ایجاد کمپیوٹر کے کچھ کورس بھی کیے جن میں اپنے شعبے یعنی نقشہ نویسی کا کمپیوٹر کورس ''آٹو کیڈ'' بھی شامل تھا جس کی وجہ سے ہاتھ سے بنانے والی ڈرائنگز کو کمپیوٹر پر بنانا ممکن ہوگیا تھا۔

سوال: آپ کا رجحان ادب کی طرف کب ہوا؟ شاعری کے ابتدائی فنی رموز سے آگاہی کیسے ہوئی؟

جواب: شاعری کی طرف رجحان نصابی کتب کی نظمیں پڑھنے سے ہوا،لڑکپن میں نعت خوانی کا شوق تھا۔اس نے بھی شاعری کے شوق کو جِلاء بخشی،تب ٹی وی کا رجحان نہیں تھا البتہ ریڈیو سننے کا شوق عام تھا۔ریڈیو پاکستان لاہور اور کراچی،ریڈیو سیلون،ریڈیو جالندھر اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس،آزاد کشمیر اور جموں کے ریڈیو سٹیشنوں سے نغمے سننے کا رواج عام تھا۔اس سے کئی نغمے اور لوک گیت زبانی یاد ہوگئے اور یوں باوزن مصرعوں کی تربیت ہوتی گئی۔میں نے پہلا شعر پانچویں جماعت (1963ء) میں کہا۔پھر ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں دو ایک ملی نغمے لکھے۔ہائی سکول کے بعد ٹی سی کے کورس کے دوران دو تین ہم جماعتوں کے ساتھ مشقِ سخن رہتی تھی۔ماچس فیکٹری کی سروس کے دوران شعری ذوق کے حامل کچھ ساتھی مل گئے اور شاعری کی مقدار کافی بڑھی مگر معیار کے مراحل ابھی دُور تھے۔پھر وسط 1976ء میں نازش کلینک بسطامی روڈ سمن آباد لاہور کے ایک طرحی مشاعرہ میں شرکت کی جہاں استادِ سخن علامہ ذوقی سے ملاقات ہوئی جو شاعرِ مزدور حضرت احسان دانش کے شاگرد تھے اور رشتہ میں نامور کلاسیکی شاعر حضرت ابراہیم ذوق (ہم عصرِ مرزا غالب) کے پَرنواسہ تھے۔علامہ ذوقی سے کوئی سوا سال تک درجنوں غزلوں وغیرہ پر اصلاح لی۔اصل میں میری شاعری کے باقاعدہ سفر کا آغاز اِسی دور سے ہوتا ہے۔لاہور کے کئی ادبی حلقوں کے مشاعروں میں کلام سنانے اور ادبی رسائل میں میرے کلام کے شائع ہونے کا آغاز بھی اسی دور سے ہُوا مگر پھر نومبر 1977ء میں لاہور سے قطر جانے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا اور میں علامہ ذوقی سے اصلاح خطوں کے ذریعے اپنا کلام بھیج کر لینے لگا تھا۔قطر کی قدیمی ادبی تنظیم بزمِ اردو قطر کے ماہانہ طرحی مشاعروں کی وجہ سے وہاں کافی غزلیں،حمدیں،نعتیں اور سلام وغیرہ کہے۔وہاں کی ادبی فضا کافی بھرپور تھی۔

سوال: جب آپ نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا تو آپ کے شہر لاہور کا ادبی ماحول کیسا تھا اور اس وقت کون سے شاعر نمایاں تھے؟

جواب: 1976/77ء میں لاہور کے مشاعرے بڑے بھرپور تھے۔تب کئی نامور شعراء ان میں شرکت کرتے تھے۔ان میں حفیظ جالندھری،احسان دانش،احمد ندیم قاسمی،طفیل ہوشیارپوری،قتیل شفائی،منیر نیازی،شہزاد احمد،مظفر وارثی،ظفر اقبال اور شورش کاشمیری بڑے نام تھے۔تب عبدالمجید عدم،ناصر کاظمی اور ساغر صدیقی بھی عروج پر تھے۔تب کئی جواں سال شعراء بھی نام پیدا کر رہے تھے۔ان میں گلزار بخاری،خالد احمد،امجد اسلام امجد،عطاء الحق قاسمی،نجیب احمد اور دیگر کافی نام تھے۔خواتین

میں کشور ناہید اور منور سلطانہ لکھنوی کافی فعال تھیں۔ روایتی شاعری کے حلقوں میں علامہ ذوقی مظفر نگری، حکیم زیبا ناروی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، ڈاکٹر عبدالرشید تبسم، یزدانی جالندھری اور کچھ دیگر بزرگ شعراء کثرت سے شعری نشستیں برپا کرتے تھے۔ پنجابی مشاعروں میں استاد دامن، احمد راہی، اکبر لاہوری، ڈاکٹر رشید انور، سلیم کاشر، رؤف شیخ، منظور وزیر آبادی وغیرہ کا شہرہ تھا۔ سنت نگر میں پروفیسر عاشق رحیل کے ہاں ''گلشنِ ادب'' کے ماہانہ مشاعرے باقاعدگی سے ہو رہے تھے۔ کچھ فلمی نغمہ نگاروں کی بھی لاہور میں خوب شہرت تھی۔ ادبی رسائل کی وجہ سے خوب گہما گہمی تھی نیز روزناموں کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشنوں کی وجہ سے لاہور اور دیگر شہروں میں ادبی رونق لگی رہتی تھی۔

سوال: جب آپ نے مشاعروں میں شرکت شروع کی تو کیا سنیئر شعراء نے آپ کا کھلی بانہوں سے استقبال کیا یا نظر انداز کرنے کی کوشش کی؟

جواب: ابتداء میں مشاعروں میں، مَیں صرف وہی کلام سناتا تھا جو اُستادِ محترم سے اصلاح شدہ ہوتا تھا اور اسی وجہ سے سبھی اس کلام کو سراہتے تھے کیونکہ یہ وزن میں ہوتا تھا اور شعری عیوب سے پاک ہوتا تھا۔ بعض نوآموز شعراء اپنے زعم میں اپنا بے وزن اور ناپختہ کلام سناتے تھے تو سنیئر شعراء اُن کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ میرے خیال میں ہر دَور کے نئے شعراء کو ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اپنا بے وزن، شعری عیوب کا حامل اور ناپختہ کلام سنانے کی بجائے اصلاح شدہ کلام ہی سنانا چاہیے۔

سوال: آپ کے ابتدائی شعری دَور میں دیگر ادبی مراکز میں کیسا ادبی ماحول تھا؟

جواب: تب پاکستان میں کراچی، لاہور، اسلام آباد، پشاور اور سرگودھا کے ادبی دبستان زیادہ سرگرم تھے۔ لاہور میں احمد ندیم قاسمی اور سرگودھا کے ڈاکٹر وزیر آغا کے گروپ باہم برسرِ پیکار تھے۔ ترقی پسند ادب، روایتی ادب اور اسلامی ادب جیسے ادبی گروپ بھی فعال تھے۔ کالجوں کی طلبہ یونینز بھی فعال تھیں اور کالجوں کے سالانہ پروگراموں میں مشاعرہ بھی کرایا جاتا تھا۔ رومانی ناول خوب پڑھے جاتے تھے مثلاً رضیہ بٹ کے ناول ''صاعقہ'' اور ''نائیلہ''۔ ان پر فلمیں بھی بنیں۔ آنہ لائبریریاں ہر بستی میں تھیں اور وہاں سے کرائے پر کتابیں لے کر پڑھنے کا معمول بھی تھا۔ سکولوں میں ''بزمِ ادب'' ہوتی تھی۔ اس ماحول میں ذوقِ مطالعہ عام افراد میں ملتا تھا اور پھر انہی میں سے تخلیق کار اُبھر کر سامنے آجاتے تھے۔ شاعری کے استاد بھی کئی بستیوں میں مقیم تھے اور یوں نئے قلمکاروں کی تربیت ہوتی رہتی تھی۔ استاد شعراء اپنے شاگردوں کے جلو میں مشاعروں میں جاتے تھے۔

سوال: آپ بیک وقت شاعر ہیں، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، روداد نگار، خاکہ نگار، ایک ادبی رسالہ ''خیال و فن'' کے مدیرِ اعلیٰ، ادبی تنظیم ''ادارہ خیال و فن'' اور ''خیال و فن پبلشرز'' کے ناظم اور دیگر متعدد ادبی جہتوں سے وابستہ ہیں، کیا آپ ان سب شعبوں سے انصاف کر پاتے ہیں؟

جواب: جی نہیں، سب کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔ ویسے بھی میرا زیادہ رجحان شاعری کی مختلف اصناف کی طرف ہوتا ہے اور زیادہ تر توجہ اسی پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے لامحالہ دیگر شعبوں کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے احباب یہی سمجھتے ہیں کہ میں باقی ادبی شعبوں میں بھی پوری مہارت سے کام کرتا ہوں۔ اسے اللہ کا کرم ہی کہوں گا۔

سوال: آپ کی اب تک کی شائع شدہ شعری و نثری کتب کی تفصیل قارئین کی آگاہی کے لیے مفید رہے گی۔

جواب: میری تاحال کوئی تیرہ شعری کتب اور چودہ نثری کتب آئی ہیں۔ ان میں غزلوں کے تین مجموعے ہیں اور قطعات کے دو، نظموں، اور ملی جلی شاعری کا ایک ایک مجموعہ ہے۔ دو مجموعے حمد و نعت کے ہیں۔ ایک پنجابی شاعری مجموعہ ہے اور پنجابی بولیوں کا الگ سے ایک مجموعہ ''لاہوری بولیاں'' کے نام سے ہے اور سات سو سے زائد بولیوں کی یہ اب تک کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ ''کلیاتِ ممتاز راشد'' حصہ اول میں میرے پانچ شعری مجموعے شامل ہیں۔ نثری کتب میں پانچ سو سے زائد صفحات کی کتاب ''لاہور کے نئے پرانے رنگ'' کی بہت پذیرائی ہوئی۔ پھر ''پاکستانی نغمہ نگاران'' بھی خوب سراہی گئی جو اس موضوع پر کسی کی بھی پہلی کتاب تھی۔ ناول اور افسانی مجموعہ بھی آیا۔ تبصرۂ کتب کے حوالے سے میری دو کتابیں آئیں۔ مضامین کی کتاب آئی۔ ضخیم سفر نامہ آیا۔ ایک کتاب والدۂ مرحومہ کے حوالے سے تھی۔ ایک کتاب میں قطر کی ادبی فضا کا ذکر تھا۔ اب میرے منتخب کالموں کی ایک کتاب آنے کو ہے اور ایک پنجابی ناول پر کام کر رہا ہوں۔

سوال: آپ نے اپنے سہ ماہی ادبی رسالہ ''خیال و فن'' کا اجراء کب کیا؟ اب تک اس کے کتنے شمارے اور خاص نمبر آچکے ہیں؟

جواب: ''خیال و فن'' کی داغ بیل میں نے 1994ء میں تب ڈالی جب میں قطر میں مقیم تھا۔ اس کے نام کی ترکیب بھی میں نے ہی تخلیق کی تھی ورنہ اس سے قبل ''فکر و فن'' اور ''فکر و نظر'' جیسی کچھ تراکیب ہی تھیں۔ ''خیال و فن'' کا پہلا شمارہ جنوری 1995ء میں آیا اور اب اس کا چھبیسواں برس جارہا ہے۔ اس کے ساٹھ سے زائد شمارے آچکے ہیں۔ ان میں درجن بھر خصوصی نمبر ہیں مثلاً حمد نمبر، نعت نمبر، علامہ اقبال نمبر، آزادی کا گولڈن جوبلی نمبر، خلیجی شاعرات نمبر، کویت نمبر، بحرین نمبر، قطر نمبر، قطر نعت نمبر، ادبی انٹرویوز نمبر، طنز و مزاح نمبر، استاد ابراہیم ذوق نمبر، مولانا شبلی نمبر، پردیس نمبر اور اس رسالہ کے 25 سال پورے ہونے پر سلور جوبلی نمبر آیا۔ اب اس کا ''لاہور نمبر'' آنے کو ہے۔ کئی نامور قلمکاروں کی تحریریں ''خیال و فن'' کی زینت بن چکی ہیں۔ کئی قلمکاروں کے خصوصی گوشے بھی آئے ہیں۔ دیگر رسالوں کی طرح اس میں شاعری اور نثر ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ ادبی محفلوں کی روداد نگاری اس کے ہر شمارے کا خصوصی حصہ ہوتا ہے اور تبصرہ کتب بھی۔ ساجد گل اور محمد شعیب مرزا اس کے مدیران رہے ہیں۔ آج کل ایم اے نعیم ہیں۔ مجلس مشاورت میں پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق خاں، اسلام عظمی، تسنیم کوثر، بیاء جی، رشید نیاز اور تمثیلہ لطیف کے نام ہیں۔ بطور بانی اور مدیرِ اعلیٰ اس رسالے کے بہت سے امور میرے ذمے ہی ہیں۔

سوال: بسلسلہ روزگار آپ 37 سال قطر کے دارالحکومت دوحہ میں رہے۔ وہاں کی ادبی سرگرمیوں، شعراء کے مزاج اور چقلشوں کے بارے میں کچھ یادگار واقعات ہوں تو بتائیں؟

جواب: میں جب 1977ء میں قطر گیا تو وہاں موجود دو بزرگ شعراء برخیا اور اسلم میر کی معاصرانہ چشمک عروج پر تھی مگر برخیا کا گروپ زیادہ فعال تھا۔ مشاعروں میں شرکت کے دوران دونوں سے اچھے تعلقات ہو گئے اور میں نے دونوں کو کئی مشاعروں میں اکٹھا کیا۔ ''بزمِ اردو

قطر'' کے مشاعرے اکثر ہوتے تھے۔ پھر کچھ دوسری تنظیمیں بھی بننے لگی اور گروپ بندی کی فضا عام ہوتی گئی۔ ان تنظیموں کے اپنے رکن شعراء اکا دکا ہی ہوتے تھے جبکہ'' بزم اُردو قطر'' کے رکن شعراء پندرہ بیس تھے اور ان میں کئی ایک کو اپنے مشاعروں کے لیے یہ تنظیمیں بلاتی تھیں جس میں کوئی ہرج نہیں تھا مگر اُن تنظیموں کے بعض شرارتی لوگ اس عمل میں'' بزم اردو قطر'' میں گروپ بندی پیدا کرنے لگے۔ اس وجہ سے اس بزم کے بھی بعض اوقات دو گروپ بن جاتے تھے۔ ادبی سیاست کے اس منفی پہلو نے زیادہ زور تب پکڑا جب وہاں کی کچھ تنظیمیں عالمی مشاعرے کرانے لگی تھیں اور عالمی مشاعروں کی کشش یا لالچ کی وجہ سے بزم اردو قطر کے بعض رکن شعراء بھی اُن کے آلہ کار بن کر بزم کے مشاعروں کی فضا خراب کر دیتے تھے تاہم بزم کا بڑا گروپ ہمیشہ ایسا رہا کہ جس کے رکن شعراء کی تعداد سب تنظیموں کے شعراء سے زیادہ ہی رہی۔ میرا قطر میں 37 سالہ قیام کے دوران آخر تک تعلق اس بزم کے بڑے گروپ سے رہا۔ میں اس بزم کے کئی عہدوں پر فائز رہا مثلاً پریس سیکرٹری، نائب سیکرٹری، جنرل سیکرٹری، نائب صدر، صدر اور چیئر مین۔۔۔قطر میں اس بزم کی عمر 25 سال ہوئی تو نامور شاعر محسن نقوی کو قطر بلا کر بڑا مشاعرہ کیا گیا۔ اس سلور جوبلی مشاعرہ کی نظامت بطور جنرل سیکرٹری میں نے کی تھی۔ بزم کی عمر 50 سال ہوئی تو بہت بڑا گولڈن جوبلی مشاعرہ ہوا جس میں پاک و ہند سے شعراء بلائے گئے۔ اس کی نظامت بھی میں نے ہی کی۔ تب میں بزم کا چیئر مین تھا۔ بزم کے عالمی ادبی سیمینارز کی بڑی دھوم تھی۔ میرے دورِ صدارت میں افسانہ سیمینار اور غالب سیمینار ہوئے اور پاک و ہند سے مشاہیر قلم کاروں کو بلا کر مقالے پڑھائے گئے۔ ادبی گروپ بندی میں یادگار واقعات کم ہی تھے، تو تکار زیادہ رہتی تھی۔ ایک دوسرے کی خامیوں کو اچھال کر مزے لیے جاتے تھے مثلاً ایک بار ایک تنظیم کا سربراہ تقریر کر رہا تھا اُسے کہنا تھا کہ جب قومیں تنزل کا شکار ہوتی ہیں تو۔۔۔۔ان الفاظ کی بجائے اُس نے جملہ یوں شروع کیا کہ'' جب قوموں کا انزال ہوتا ہے تو۔۔۔اس پر کئی روز اس کی بھد اُڑائی گئی۔ ایک تنظیم کے چیئر مین ادیب و شاعر نہیں تھے اور استقبالیہ کلمات کسی سے لکھوا کر پڑھتے تھے۔ ایک تقریر میں انھوں نے ایک جملہ یوں شروع کیا کہ'' میرا برگر برگر یہ مطلب نہیں کہ۔۔۔۔۔۔'' حاضرین حیران تھے کہ یہ'' برگر برگر'' کیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ کہ اُن کو'' ہرگز ہرگز'' لکھ کر دیا گیا تھا مگر وہ نقطوں کی کمی بیشی سے اسے'' برگر برگر'' پڑھ گئے تھے۔ ایسے اور بھی'' دلچسپ سانحے'' پیش آتے رہتے تھے۔

سوال: کیا آپ موجودہ ادبی منظر نامے سے مطمئن ہیں؟

جواب: پوری طرح مطمئن تو نہیں مگر غنیمت ہے کہ کافی تعداد میں نثری و شعری کتب شائع ہو رہی ہیں۔ کئی ایک کا معیار بھی عمدہ ہے۔ ادبی محفلیں بھی عروج پر ہیں۔ کئی ادبی رسائل بڑی استقامت سے کئی کئی عشروں سے شائع ہو رہے ہیں۔ ایوارڈز اور اسناد وغیرہ کے ذریعے سینکڑوں قلمکاروں کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ کچھ سرکاری ادبی ادارے مزید متحریک ہو جائیں تو نتائج اور بھی اطمینان بخش ہو جائیں گے۔

سوال: آپ کا نظریہ شعر و ادب کیا ہے؟

جواب: میں'' ادب برائے زندگی'' کا قائل ہوں تاہم میں اس بات کا بھی حامی ہوں کہ'' معیار'' کی ہمہ وقت اہمیت ہونی چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ ادب کی تخلیق میں آپ کا نظریہ تو سامنے آ جائے مگر فن کے تقاضے مجروح ہو رہے ہوں۔ اگر نظریہ ہی پہنچانا ہو تو اس کو کسی ادبی تخلیق کے بغیر کسی مضمون وغیرہ کے ذریعے پہنچایا جا سکتا ہے اگر یہ کسی ادبی تخلیق کے ذریعے ہی پہنچانا ہو تو پھر تکنیکی پہلوؤں وغیرہ کے فنی تقاضے بھی پورے ہونے چاہئیں۔

سوال: کیا آپ کو آپ کی ادبی کاوشوں کے سلسلے میں حکومتی سطح پر کسی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے؟

جواب: میں 37 سال قطر میں رہا۔ پردیس میں سفارتخانہ ہی حکومت ہوتی ہے۔ سو قطر کے سفارتخانہ پاکستان سے مجھے تحسینی اسناد ملتی رہیں۔ سفارتخانہ کے تحت وہاں جو پاکستان انٹرنیشنل سکول (سابقہ پی ای سی) ہے اُس کے بورڈ آف گورنرز کی تعداد دس بارہ ہوتی ہے۔ تو مجھے بھی کمیونٹی میں سے اس کا ممبر بنایا گیا اور یہ منصب میری مستقل ادبی خدمات کے حوالے ہی سے تھا۔ ویسے آپ کا اشارہ اگر حکومت کے تمغوں وغیرہ کی طرف ہے تو ایسا کوئی تمغہ نہیں ملا۔ البتہ میرے شوق یعنی'' ادب'' کے حوالے سے سرگرم بیس سے زائد ادبی تنظیموں سے مجھے ایوارڈز اور اسناد مل چکی ہیں اور میرے نزدیک ادبی تنظیموں سے ملنے والے اعزازات کی اہمیت کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہے۔

سوال: ایک شاعر یا ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

جواب: ادیب یا شاعر کا معاشرے میں کردار بہرحال ایک عالم دین، مبلغ، مصلح، صوفی یا معلم کا تو نہیں ہوتا۔ ادیب یا شاعر اپنی تخلیقات کے ذریعے فکری رہنمائی تو کر سکتا ہے مگر ساتھ ساتھ وہ تعمیری ادب پیش کرنے کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے اور تفریحی ادب پیش کرنے کا بھی۔ وہ معاشرتی اقدار کی عکاسی بھی کرتا ہے اور ان کی ناہمواریوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ وہ نغموں، گیتوں، غزلوں اور نظموں وغیرہ کے ذریعے ذوق ادب کی تسکین و تفریح کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور جذبات کی ترجمانی و پاسبانی بھی۔ اس لیے ادیب و شاعر کو معاشرے میں اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

سوال: ہمارے رسالہ'' ارژنگ'' کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

جواب: قارئین کے لیے یہی پیغام ہے کہ کتابوں سے اپنی دوستی کو روز بروز فروغ دیتے رہیں، اپنے مطالعہ کے ذوق و شوق میں ادبی کتب کے مطالعہ کو ترجیح دیں۔ احباب کو تحائف دیتے وقت کتابوں کا تحفہ دیں۔ ادبی رسائل کے فروغ میں اپنا ہر ممکن کردار نبھائیں۔ ادبی محفلوں میں شرکت کو معمول بنائیں بلکہ ادبی محفلیں برپا کرنے کی کوشش بھی کریں۔ اپنے ذوق ادب کو معیار کے زیور سے آراستہ کریں۔ کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ عصری ادب اور جدید لب و لہجہ کے ادب کو بھی اپنے شعور کا حصہ بنائیں۔ ادبی مکالمہ کی روایت کا حصہ بنیں۔ اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو کسی نہ کسی ادبی موضوع پر لکھتے رہیں اور اگر آپ کی تحریریں کافی تعداد یا مقدار میں جمع ہو چکی ہیں تو انھیں جلد از جلد کتابی صورت دیں تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچیں اور لوگ آپ کی تحریری و تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کریں۔ اپنے ادبی رویے میں فراخدلی، شائستگی مثبت قدروں اور نرم روی کو فروغ دیں۔ خوبصورتیاں بانٹیں، ہمدردی، تعاون، نظم و ضبط، قانون کی پاسداری اور ایمانداری کو اپنائیں۔ سوک سینس اور ٹریفک سینس وغیرہ کا بھی ضرور اہتمام کریں۔

نامہ ہائے احباب

صاحبِ دل حسن عباسی! ارژنگ رقم

آپ بھول چوک کو نظر انداز کرنے والے صاحب ہیں۔ خدا آپ کو اسی طرح نیک قلم خوش انداز رکھے۔ کہتے ہیں شاعر سردار رشک رم کے سوا بھی بہت پر پرزے رکھتے ہیں۔ جو صاحب اسلوب نکالتے رہتے ہیں۔ اب کے ارژنگ میں سلطان سکون اور عبدالوحید بسمل کی غزلیں ہزارے کے پھولوں سے بھرپور تھیں۔ کہتے ہیں شاعری بصیغہ زائد المیعاد نہ ہو۔ سکون بسمل ٹھہرے غزل کے دھنی خوب کہتے ہیں۔ ارژنگ کو ہزارے کا ''پھلاں دا کھارا'' خوش آ گیا ہے۔ رفعت وحید کے خصوص میں محترم جمیل یوسف کا نثر پارہ آسمان سے اترا ہوا نثر ستارہ نظر آتا ہے۔ رفعت وحید کی شاعری ہمہ جہت خوبیوں سے شاد آباد ہے۔ ایک بار میں نے بھی ان کی غزل کے ایک شعر کا حوالہ دیا تھا۔ جسے محترم جمیل یوسف نے اپنے خط میں مذکور کیا ہے۔ جمیل یوسف پسندیدہ اشعار کے انتخاب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی سخن فہمی بامِ عروج پر ہے۔ انہوں نے نئے شاعروں پر مضامین بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان کی اخلاص بندی اور توجہ بہتوں کے کام آ رہی ہے۔ وہ پرانے لکھنے والے ہنر مند شاعر ادیب ہیں۔ محبت، سلوک اور سب سے بڑھ کر مروت ان پر ختم ہے۔ ادبی اسلوب جو شاعر ادیب کو الگ شناخت دیتا ہے وہ ان کی نظر میں ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے جمیل یوسف صاحب شاعری اور نثر کو موضوع نقد کرتے ہیں۔ نتھیا گلی، مری کی تحفہ شاعری اقبال کیفی نے ہم پہنچائی۔ میں نے ان کا نام پہلی بار ارژنگ سے سنا ہے۔ ماشاء للہ خوب کہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہزارے کے دلدادہ ہیں۔ اسی بھروسے پر ہم آپ کو خط لکھتے ہیں۔ آپ کی سلامتی کی دعا کے ساتھ کرونا وائرس!! خدا خیر کرے

خیر اندیش/آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

محترم ومکرمی جناب عامر بن علی جناب حسن عباسی!

سلام مسنون! آپ کی ادارت میں ماہنامہ ارژنگ ادب کا معتبر حوالہ بنتا جا رہا ہے۔ ہر جریدہ ادب کا بہترین معیار اور انتخاب بن کر طلوع ہوتا ہے۔ جب تک صفحہ اول سے آخر تک پڑھ نہ لیں ادبی تشنگی نہیں بجھتی۔ ہر تحریر اپنی جگہ پر نگینے کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہے۔ ارژنگ کے ادبی حسن کو اگر اس شعر میں سمیٹوں تو بے جا نہ ہوگا۔

جو حسیں شکل ہے آنکھوں میں اُتر آتی ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ تماشا کیا ہے

عباسی صاحب! اس عہد رائیگاں اور کم نگاہاں میں ارژنگ جیسے معیاری رسالے کو جاری رکھنا آپ اور آپ کی ٹیم کا کریڈٹ ہے۔ اس مشکل کام کو آپ جس آسانی سے سرانجام دے رہے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ خدا آپ کی یہ ادبی عبادت قبول فرمائے۔ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

احمد جلیل/اوکاڑہ

محترم جناب عامر بن علی!

تسلیمات۔ اُمید ہے بفضل رب کریم خیریت سے ہوں گے۔ مئی 2020ء کا ارژنگ نظر نواز ہوا۔ لاک ڈاؤن کے دوران ارژنگ صفحہ صفحہ سطر بہ سطر اور حرف بہ حرف پڑھنے کا موقع میسر آیا۔ حمد، نعت، سلام، شعری گوشے اور شاعری کے تمام سلسلے ارژنگ کا حسن ہیں۔ مضامین میں عطاء الحق قاسمی کا مضمون آئی لو یو سید ضمیر جعفری اپنے عنوان سے ہی پرکشش لگا تو سب سے پہلے اسے پڑھا۔ سید ضمیر جعفری میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے ہلکے پھلکے انداز میں ان کا ذکر کر کے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے۔ میں کیوں لکھتا ہوں جمیل یوسف صاحب کا ایسا مضمون ہے کہ اس موضوع پر میں نے اس سے اچھا مضمون کسی اور جگہ نہیں پڑھا۔ ان کو میری طرف سے خصوصی داد دیجیے گا۔ مستقل سلسلوں میں ڈاکٹر مختار عزمی کے تنقیدی مضامین باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ وہ ہمارے عہد کے معتبر ناقد ہیں۔ تخلیق کے زاویے ان کا مضمون بہت معلوماتی اور تحقیقی ہے۔ افسانوں میں آغا گل، محمد طارق علی اور شائستہ مفتی کے افسانے اپنی بنت اور کرداروں کے حوالے سے بہت جاندار اور قابل مطالعہ تھے۔ فقیر اللہ خان کا سفرنامہ ''امریکیات'' اور آپ کا سفرنامہ ''دنیا میری نظر میں'' نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے۔ کورونا اور لاک ڈاؤن کے دوران اس سیر نے ساری بوریت ختم کر دی۔ بلاشبہ دونوں بہت دلچسپ اور معلوماتی سفرنامے ہیں۔ رئیس عباس زیدی کی آپ بیتی اتنی دلچسپ ہے کہ میں کتاب پڑھنے کا خواہش مند ہوں۔ فاروق طراز اور خالد یزدانی کے انٹرویوز سے بہت سی باتیں سیکھنے کو ملیں۔ بلاشبہ ان میں دانش کے موتی بکھرے ہوئے تھے۔ لبنیٰ صفدر کا خاص مضمون ''کرونا خطرناک وبا'' بہت معلوماتی اور حسب حال تھا۔ کورونا کے حوالے سے شاعری کا الگ گوشہ شائع کر کے آپ نے نیک کام کیا۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے۔ ارژنگ کے نئے شمارے کا ابھی سے انتظار ہے۔

آغاز تنویر/کراچی

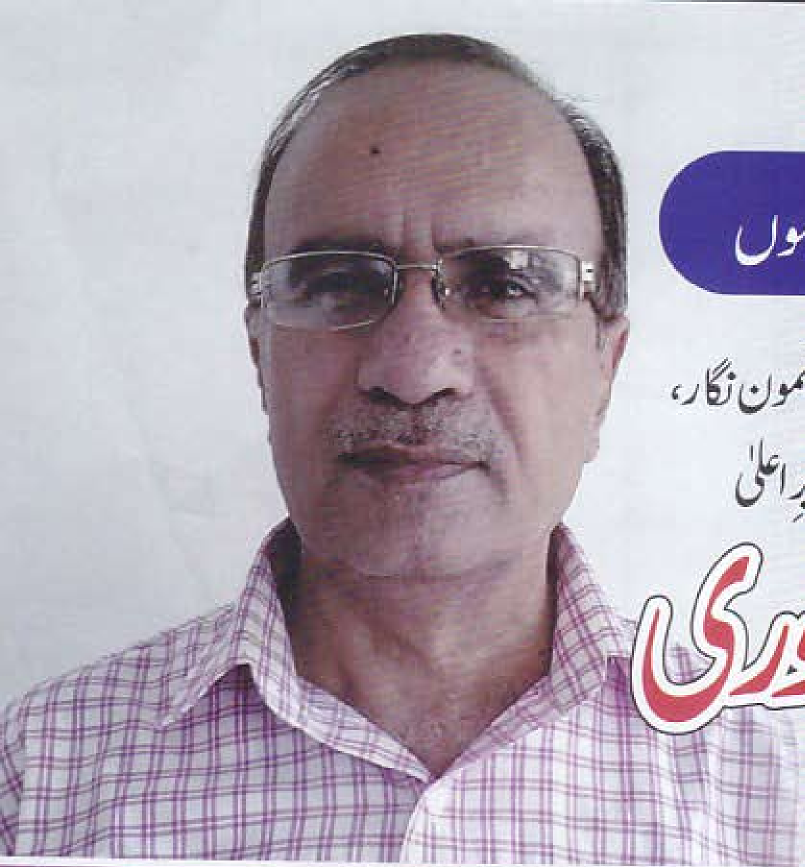

میں ''ادب برائے زندگی'' کا قائل ہوں

نامور شاعر، سفرنامہ نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، رودادنگار، خاکہ نگار اور ''خیال وفن'' کے مدیرِ اعلیٰ

محمد ممتاز راشد لاہوری

سے حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

موجودہ ادبی منظرنامے سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں

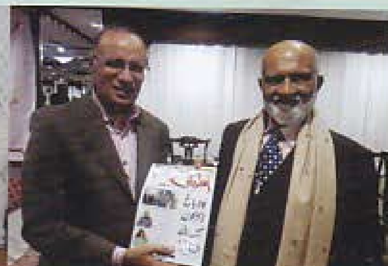

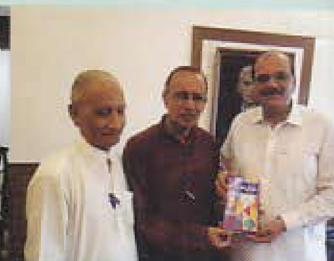

سوال: اپنے بچپن اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میرے والد میاں محمد شفیع کے بچپن میں ان کی والدہ فوت ہوگئی تھیں۔ سوتیلی والدہ کے ناروا سلوک کی وجہ سے وہ تین چار جماعتیں ہی پڑھ سکے اور عملی زندگی میں پڑ گئے۔ والدہ کی طرف سے انھیں اپنے آبائی موضع محمود بوٹی لاہور کی نورانی سٹریٹ نمبر 11 کے مکان نمبر 14 کی وراثت ملی تھی۔ انکی شادی کوچہ غلام دستگیر (گلی نمبر 130) چراغدین روڈ مزنگ لاہور کی صغریٰ بی بی (میری والدہ) سے 1951 میں ہوئی۔ پہلا بیٹا چار ماہ کی عمر میں فوت ہوگیا۔ دوسرا بیٹا مَیں تھا۔ میری پیدائش 25 نومبر 1953 کو ننھیال میں ہوئی۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی محمود بوٹی والے گھر میں گزاری۔ یہ بستی اب لاہور رنگ روڈ کے ''محمود بوٹی انٹرچینج'' کے پاس ہے۔ پہلے یہاں سے دریائے راوی کے پُل تک جانے والی سڑک ''بند روڈ'' روڈ کہلاتی تھی کیونکہ راوی کے سیلاب سے لاہور کو بچانے کے لیے یہاں سڑک کے ساتھ ساتھ طویل بند بنا ہوا تھا۔ پرائمری سکول تک میری تعلیم چوک محمود بوٹی کے قدیمی ایم سی پرائمری سکول میں ہوئی۔ میٹرک مَیں نے 1969ء میں شالامار باغ لاہور سے متصل قدیمی گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ سے کیا تھا۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

معروف شاعر، مقبول کالم نگار اور منفرد مترجم و مدیر اعلی ارژنگ

عامر بن علی

شائع ہو گیا

کی منتخب شاعری کا انگریزی و روسی زبان میں ترجمہ

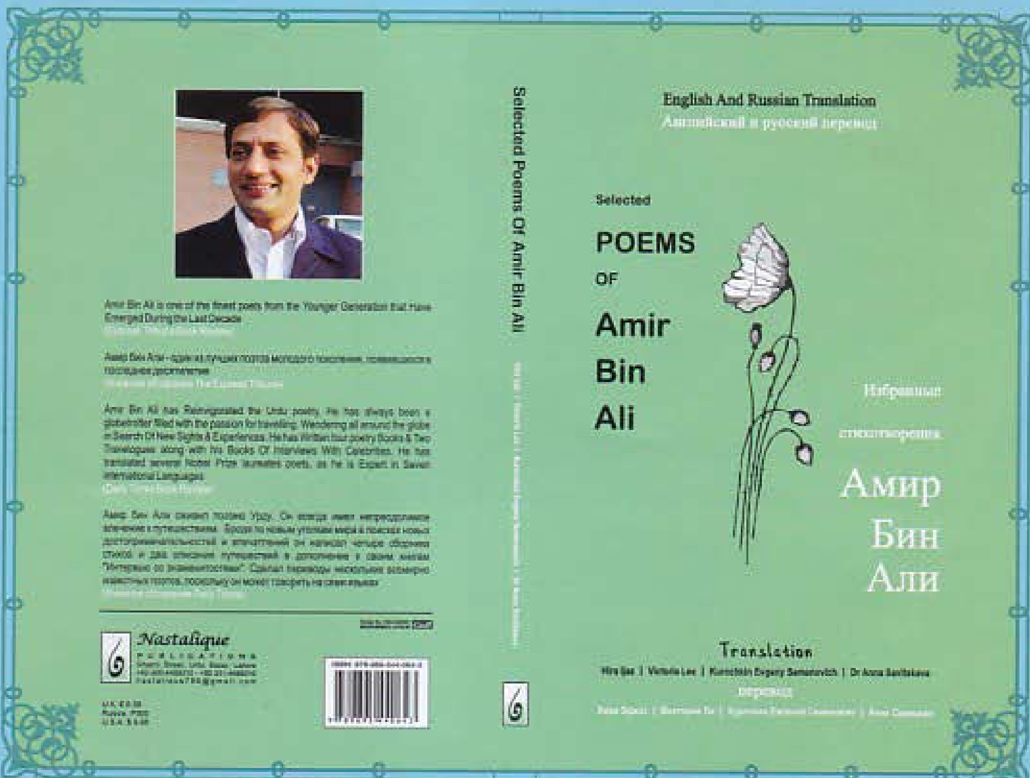

پاکستان کے اہم کتب خانوں کے علاوہ ای۔کامرس کی تمام اہم عالمی ویب سائٹس پر دستیاب ہے۔

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

تعارفی قیمت بمہ ڈاک خرچ 1000 روپے

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com